آبلے
احمد ندیم قاسمی

ہندوستان کا ہمیشہ خون چُوستے رہنا چاہیے۔

(لارڈ سالسبری)

اگر کبھی انگریزوں کو ہندوستان اِسی طرح چھوڑنا پڑا جس طرح رومنوں نے انگلستان چھوڑا تھا، تو ایک ایسا ملک چھوڑ جائیں گے جس میں نہ تعلیم ہوگی نہ حفظانِ صحت کا سامان ہوگا اور نہ ہی دولت۔

(سرڈی ہملٹن)

زمین کی فتح کے بعد ہندوستان کا دفاع بھی فتح کرلیا گیا۔

(ہنٹر)

رپیرو کا باپ حکومت کے خیراتی ہسپتال میں تھا' لیکن اس ہسپتال کے خداوندوں نے اُس سے گھر کے چھاج اور چنگیریں تک ہتھیالی تھیں۔ ٹین کے ٹوٹے ہوئے ڈبّوں اور مٹّی کے پرانے برتنوں کے ساتھ توّے کا کڑا بھی کمپونڈر کی نذر ہو گیا تھا۔ ڈاکٹرنی نے بھی مذکروں کی اِس لوٹ کھسوٹ میں اپنے طبقے کی حق تلفی محسوس کرتے ہوئے دو تکیوں کی شہری فرمائش کی' اور جب تکیے نہ مل سکے تو خالی خولی روئی ہی کو غنیمت سمجھا۔ ڈاکٹر انچارج کے داماد جو لاہور کی کسی فرم میں ملازم تھے' پانچ روز کی چھٹی پر آئے تو پیرو سے دس مرغوں کی فرمائش کی اور بصورتِ دیگر بوڑھے کے ٹیکے بند کروا دینے کی دھمکی دی۔ آخر جب وہ اپنے سارے گھر کی جمع پونجی لٹا بیٹھا' اور ایک شام کو ڈاکٹر اور کمپونڈر کے مشترکہ ارشاد یعنی گلّے کی آخری بھیڑ کو کاندھوں پر لٹکائے ہسپتال کے صدر دروازے تک آیا' تو نوزائیدہ بکائن کے سائے میں ڈاکٹرنی صاحبہ بیٹھی تھرمامیٹر دھوتی نظر آئیں' اور ڈاکٹر صاحب بر آمدے میں کمپونڈر کے ہاتھ میں تھامی ہوئی ایک پلیٹ سے پکوڑے کھاتے دکھائی دیئے۔ ایک مرتبہ پھر اُس نے بکائن کی

طرف دیکھا اور بھیڑ کو وہیں پٹخ کر بکائن کی طرف کچھ اِس انداز سے بڑھا جیسے اس کے تنے کو مٹھیوں میں بھینچ کر چومے گا۔ اور اس سے پوچھے گا۔ "اچھی بکائن، ننھی بکائن، میرا ابا کیا ہُوا، کیا تو اپنی ذرا سی چھاؤں بھی اس غریب کو نہ دے سکی۔" مگر ابھی وہ بکائن کے قریب نہیں پہنچنے پایا تھا کہ برآمدے میں پڑے ہوئے ایک مریض نے بھرّائی ہوئی آواز میں کہا۔ "گبھرو! بکائن کے سائے میں مِس بیٹھی ہے اور تیرے باپ کا مُردہ جسم ہسپتال کے باہر حد بندی کی چھاؤں میں پڑا تیری راہ تک رہا ہے۔"

ایک لمحے کے لئے اس کی نسیں کھنچ کر رہ گئیں۔ بکائن کی جھومتی ہوئی ڈالیوں نے اُبھر اُبھر اور لچک لچک کر کہا۔ "ہم بے بس تھیں، ہم بالکل بے بس تھیں" مِس نے تھرمامیٹر کو کیس میں بند کرتے ہوئے کہا۔ "سَوری ہم کو افسوس ہے۔" پلٹ کر اس نے ڈاکٹر کی طرف دیکھا تو وہ بھیڑ کی چکی کے پاٹ کی طرح پھیلی ہوئی دُنبی کو ٹٹول ٹٹول کر چربی کے وزن کا اندازہ لگا رہا تھا۔ حواس باختہ پیرو اس کے قریب آیا تو وہ بولا۔ "اچھی بھیڑ ہے۔ صرف چربی کا چکر مکمل نہیں، اور ہاں، چچ چچ چچ، بھئی بہت افسوس ہے، تمہارا باپ مرچکا ہے، اس کی لاش کو جلدی ٹھکانے لگاؤ، ورنہ گرمیوں کا موسم ہے نا، بُو پڑ جائے گی، سمجھے؟ جاؤ ——— اور ہاں مہتر کو چونی ضرور دے دینا۔"

تحائف کی بھرمار نے اس کے ذہن میں ٹیکوں کو اِتنی مسیحائیت بہم پہنچا رکھی تھی کہ اس نے باپ کے مردہ جسم کا تصور بھی کبھی نہیں کیا تھا۔ اور اب جب بھنگی نے ایک کھٹولے کو اس کے حوالے کرتے ہوئے ایک چونی کا مطالبہ کیا تو وہ کچھ سوچنے لگا کہ اپنے ماضی کی اِس بے حس و حرکت یادگار کو وہ گاؤں تک کیسے لے جائے۔ گاؤں واپس جا کر چند آدمی بلا لائے، لیکن لاش کے متعفن ہو جانے کا خوف تھا۔ لاش کو اپنے سینے سے لگا لے جائے، لیکن یہ عجیب و غریب جنازہ علاقہ بھر میں ضرب المثل بن کر رہ جائے گا۔ ناچار وہیں ایک پائے

کو پکڑ کر بیٹھ رہا۔ کچھ دیر کے بعد اٹھا اور بھنگی کو چند لمحے مزید رکے رہنے کی التجا کی اور ایک اور چونی کا وعدہ کر کے وہ قصبے کی مسجد میں آیا۔ مولوی صاحب سے استدعا کی۔ فوراً چند نوجوان تیار ہو گئے اور بوڑھے کی لاش آدھی رات کو گاؤں میں پہنچی۔

کفن دفن اور جمعرات، چالیسویں سے فارغ ہو کر جب اس نے گھروندے کے اثاثے پر نظر ڈالی، تو چند گاگروں، مٹی کے چند پرانے پیالوں اور ایک بھونڈے سے چولہے کے سوا اور کچھ نہ پایا۔ یہ ساون کے دن تھے، خون پانی ایک ہو کر رگوں میں غنودہ سی سرسراہٹ پیدا کرتے، دماغ کی نسیں تشنجی انداز میں کھچ کھچ کر ڈھیلی ہوتیں اور کئی مرتبہ جیسے جھولنے لگتیں۔ ویران کوٹھے میں جب وہ اکیلا، چپ چاپ، چھت پر کھیلتی ہوئی بوندوں کی رِم جھم سنتا، اور کواڑوں کی فراخ جھرّیوں میں بجلی کی لمبی سُبک قلمیں اگ کر گھل جاتیں، جب چھت کے سوراخ سے پھوار کا ایک حصہ لپک کر اس کی پیشانی پر سُرسُریاں سی دوڑا دیتا اور باہر دیوار سے لٹکتے ہوئے ڈول میں ٹھٹھرتی ہوئی ہوا گھس کر ہُنکارے بھرتی تو وہ بستر سے اُٹھ کر فرش پر چلنے لگتا۔ بادل کی گرج بند ہوتی تو ٹڈیاں چیختیں اور ٹڈیاں چپ ہوتیں تو کواڑوں میں بجلی کے فوّارے سے اُبل پڑتے، اور جب فوّارے ناپید ہو جاتے، تو ڈول میں دبکی ہوئی ہوا فرّاٹے بھرتی۔ وہ دیواروں کو مَس کرتا۔ اندھیرے کو چھونے کی کوشش کرتا۔ کواڑ کی زنجیر بجاتا۔ اسے کھول کر باہر جھانکتا۔ روشنی اور اندھیرے کی خوفناک جنگ میں کھیت سیّال چاندی کے تھالوں کی طرح اچھل اچھل کر فضا میں کھو جاتے اور پہاڑی نالوں کے واویلا میں دُور بھیڑوں کی بھدی "با آبا آ" مدغم ہو کر گرج اور کڑک کی ہیبت ناکی میں مزید رنگ بھر دیتی۔ وہ سونے کی کوشش کرتا مگر کوشش سے لائی ہوئی نیند تو بالکل اس احساسِ نیم خوابی کے مشابہ ہے جو سر پر زنّاٹے کی لٹھ پڑنے سے تیورا کر گرنے والے انسان کے شعور میں جاگ اٹھتا ہے۔ انھی

نیم خوابیوں میں اکثر اوقات پیرو ساون کے شور و شغب سے بیگانہ ہو کر ایک سکوں زار میں پہنچ جاتا' جہاں کی ہر چیز اس کے کانوں پر پھنکارتی۔ "سوچ' کچھ تو سوچ ، کچھ تو سوچ"—— اور وہ سوچتا: زمین بیچ دوں؟ نوکر ہو جاؤں؟ مکان فروخت کر ڈالوں؟ بھیک مانگنے لگوں؟ کسی دُور کی نگری میں جا کر سیّد بن بیٹھوں؟ آخر کیا کروں؟ کیا کروں؟ کیا کروں؟

اور جب وہ صبح کو اٹھتا تو یہ سوال اُس کے کانوں میں' اُس کی نبضور میں' اُس کی آنکھوں کی جھپک میں ایک کرب آمیز آہنگ پیدا کرتا ہوا شش جہت میں گونج اٹھتا۔ "کیا کروں؟ آخر کیا کروں؟"—— کچھ کرنے کا احسا اس پر جنون بن کر سوار ہو گیا تھا۔ کئی مرتبہ وہ غیر متعلقہ لوگوں کا ہاتھ بٹا لگتا۔ پگڈنڈیوں کو میلوں تک کنکریوں سے صاف کرتا۔ پنگھٹ کی بھد سیڑھیوں پر چپٹے پتھر جماتا۔ قبرستان کی ٹیڑھی بے تکی دیوار کی مرمت کرتا۔ مسجد کے گندے پانی کے گڑھے صاف کرتا۔ چوپالوں پر اجنبیوں کی رسّیاں بٹتا شاہراہوں کے موڑوں پر بیٹھ کر مسافروں کو پانی پلاتا' اور جب اس کی ان عجیب و غریب مصروفیتوں سے گاؤں والوں نے یہ اندازہ لگایا کہ اس کا دماغ چل گ ہے' یا چل جانے کے قریب ہے تو وہ ایک اور سوچ میں پڑ گیا۔

اور اُس روز چوپال پر جا کر اس نے اعلان کر دیا کہ وہ اپنا رہائشی مکا بیچنا چاہتا ہے۔ جس کسی کو ضرورت ہو' وہ اس سے ایک ہفتہ کے اندر اند فیصلہ کر لے اور نقد رقم دے کر مکان سنبھال لے۔ ذیلدار تو ایسے گرے پڑ شکاروں کی تلاش میں رہتا تھا' ٹھک سے سودے کی ہامی بھر لی۔ ادھر تقاضے حوصلہ ہی کہاں تھا! پیرو کو اپنا مکان اونے پونے بیچ ڈالنے کی دُھن تھی اور مکا بِک رہا تھا۔ رقم کی کمی بیشی سے اسے کوئی غرض نہ تھی۔ لوگ حیران تھے بوڑھے کی طویل علالت میں اس کے ڈھور ڈنگر تو خیر بِک ہی گئے تھے' یہ مکا بیچ کر کہیں جُوا کھیلنے تو نہیں چلا! کہیں بیوی خریدنے تو نہیں جا رہا!

—— کہیں دکان کھولنے کا شوق تو نہیں چرّایا! مگر پیرو نے رقم حاصل کرتے ہی دور دراز تھلوں کا سفر کیا' اور سفید بیلوں کا ایک خوبصورت جوڑا اور ایک رنگین ہل خرید کر گاؤں کی راہ لی۔

دوپہر کا وقت تھا اور بھادوں کی ابتدا تھی۔ زمینوں سے دھؤاں اٹھ رہا تھا۔ گلیاں سنسان پڑی تھیں۔ لوگ چھپروں یا بیریوں' بکائنوں کے نیچے پڑے کروٹیں بدل رہے تھے اور ہوا جیسے ایک مقام پر جم کر رہ جانے کے تجربہ میں مصروف تھی۔ لیکن ہانپتے ہوئے بیلوں اور چمکتی ہوئی ہل کے احساس ملکیت سے سرشار وہ گاؤں سے باہر نکلا چلا گیا۔ چھپروں تلے لوگوں نے پُراسرار سرگوشیاں کیں۔ چند لوگوں نے اس سے بیلوں کی قیمت اور اِس کڑکتی دھوپ میں ہل چلانے کے قصد کی وجہ بھی پوچھی' لیکن اس نے ہر شخص کے سوال کا صرف یہی جواب دیا۔ "نئی جوڑی خریدی ہے' دیکھوں تو سہی' آخر کچھ جان بھی ہے ان میں یا چونے گچ قبر میں بے ایمان مُردے والا معاملہ ہے۔"

اس کی زمینیں مسلسل بارش کے بعد ہل کی راہ تکتے تکتے چیخ کر رہ گئی تھیں۔ جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی زمین میں رنگا رنگ نسلوں کے چیونٹے رینگ رہے تھے اور کہیں کہیں نہایت گنجان گھاس اگ رہی تھی۔ مینڈوں پر جھاڑیوں کی چھاؤنی چھا رہی تھی اور حنظل کی بیلوں نے شاداب ترین قطعوں میں ہریالی کی جالی سی بُن رکھی تھی۔ بہت پرے کھیتوں سے ملحقہ بلندی پر اسے دو بکریاں چرتی نظر آئیں تو پکار اٹھا۔ "ابے کون ہے بکریاں چرانے والا؟"

ایک بیری کے سائے میں ایک لڑکا اٹھا اور بولا۔ "مَیں۔"

"تو کون؟" پیرو گرجا' اور آس پاس کی پہاڑیوں نے تالیاں بجا دیں۔

لڑکا دو جھکتے ہوئے قدم اٹھا کر بولا۔ "مَیں۔ مِیرا۔ نُورے دھوبی کا لڑکا۔"

ادھر بڑے راستے پر اَدھیڑ عمر کے دو دہقان بیلوں کی اس مرمریں

جوڑی کو دیکھنے کے لئے رک گئے تھے اور پیرو جو کھیتوں کی وسعتوں پر اپنے وجود کے شہپر پھیلا کر نہایت غضبناک ہو چکا تھا اور وحشت میں حنظل کی بیلیں اکھیڑ اکھیڑ کر مرے ہوئے سانپوں کی طرح کگروں پر پٹختا جاتا تھا' اِن دو اجنبی تماشائیوں کی موجودگی کے احساس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ بولا۔ "تو یتیم ہے میرے۔ اور نُورا ہمارا اپنا دھوبی تھا؛ چرالے بکریاں' پر دیکھ' تیری جگہ کوئی اَور ہوتا تو جانتا ہے کیا سلوک ہوتا اُس سے؟۔" اور اس نے ایک موٹے سے حنظل کو توڑ کر پتھروں پر پٹخ دیا؛ چھلکا ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا اور بیج ایک ایک ہو کر بکھر گئے۔

لڑکا بولا۔ "جی پھر نہ چراؤں گا۔"

پیرو بیلوں کو تھپکاتا ہوا بولا۔ "ارے چرالے' چرالے' جب تک چاہے چرالے۔ یتیموں کی آہ سے تو فرشتے بھی ڈرتے ہیں' اور پھر گھاس کے اِتنے بڑے رقبے کو میرے ان دو سفیدوں کے سوا اور ہے ہی کون چرنے والا۔" اُچٹتی نظر سے اس نے اجنبیوں کو دیکھا' جن کے چہروں پر پیرو کے الطافِ خسروانہ کے اثر سے جذبۂ احترام کی چمک دوڑ گئی تھی۔ ان میں سے ایک بولا۔ "بھئی جیتا رہے تیرا جوڑا۔ کیسے پاک بول ہیں تیرے؛ کہاں سے لایا یہ جوڑی؟"

"بھئی اللہ نے دی۔" اُس وقت اگر پیرو کے ڈاڑھی ہوتی تو یقیناً اسے اپنی مٹھی میں لے لیتا۔

"اللہ تو سبھی کو دیتا ہے۔" دوسرا بولا۔ "پر خریدی کس سے؟"

"بس اللہ نے دی۔" اس نے ہَل کی ہتھی کو چادر سے رگڑ کر چمکاتے ہوئے کہا۔

اور اجنبیوں نے سرگوشیاں کرتے ہوئے اپنی راہ لی۔ وہ دور تک مُڑ مڑ کر بیلوں کو دیکھتے چلے گئے اور پیرو سکون و اطمینان کی نئی نئی جنتوں سے لذت

یاب ہوتا مستقبل کے تاریک ترین گوشوں تک اُڑتا چلا گیا۔

بیلیں اُکھیڑ اُکھیڑ کر اس نے ایک ڈھیر لگا دیا؛ جھاڑیوں کی جڑیں پتھروں سے کُتر کر انہیں دور پھینک دیا اور پھر بسم اللہ پڑھ کر جو ہل کی ہتھی پر ہاتھ دھرا ہے' تو شام سے پہلے ہی سفیدوں نے تینوں کھیتوں کو الٹ پلٹ کر رکھ دیا۔ بھیگی ہوئی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو سے فضا چھلکنے لگی۔ ہل کی پھال ڈوبتے ہوئے سورج کی گلابی روشنی میں شعلے کی زباں بن کر چمک اٹھی۔ پسینے سے شرابور سفیدے ڈھلان پر گھاس چرنے لگے اور بکریوں کا رکھوالا چوٹی سے اُتر کر بکریوں کی طرف رینگا" کہ معاً" پیرو کو رات کا خیال آیا۔ وہ خود تو چوپال کے کسی چوڑے چکلے پتھر یا مسجد کے فرش پر سو سکتا تھا۔ مگر یہ دو سفیدے! یہ دودھ ملائی کے سانچوں میں ڈھلی ہوئی دو منہ زور بجلیاں' جن کے کھُروں کے نیچے کوئی نُکیلا پتھر آ جاتا تو پیرو "حسبی اللہ۔" پڑھنے لگتا تھا۔ ان جگر کے دو ٹکڑوں کو کہاں رکھے گا؟ مکان تھا تو بیل نہ تھے' اب بیل ملے تو مکان نہیں —— تو ہو سکتا ہے کہ اگر کوئی مکان مل گیا تو یہ بیل نہیں رہیں گے۔

کوئی نیا مکان بنانے کی سبیل تو پہلے بھی اس کے ذہن میں نہیں تھی۔ اب مکان اور بیلوں کے اِس خوفناک تصادم نے اس کے جذبۂ خانہ بدوشی کو شہ دی اور اپنی زمین سے ملحقہ ڈھیری پر ایک چھپّر کھڑا کر لینے کی تجویز سوچتا وہ پسینے سے بھیگے ہوئے سفیدوں پر ہاتھ پھیرنے لگا لیکن اس ویرانے میں اپنے عزیز ترین سرمایہ کو ایک غیر محفوظ چھپّر کے حوالے کر دینا اسے اچھا معلوم نہ ہوا۔ دیر تک وہ اس مخمصے میں گرفتار رہا کہ میرا ایک بکری کے پیچھے بھاگتا ہوا اس کے قریب سے گزرا۔ بیل بھڑک اٹھے اور بکری ایک گنجان جھاڑی میں پھنس کر زور زور سے ممیانے لگی۔

بیلوں کو تھپکیوں اور چمکاروں سے تسلّی دیکر اس نے بکری کو جھاڑی سے نکالا' اور میرے کے سر پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "میرے! تمہارے گھر میں کون

کون رہتا ہے؟"

ہیرے نے بکری کے لمبے کان مروڑتے ہوئے کہا۔ "میں' میری ماں' کموں میری بہن' یہ بکریاں۔"

"تمہارے آنگن کے پچھلے کونے میں ایک پرانا سا چھپّر تھا نا۔ وہ اب ہے کہ نہیں؟"

"ہے"

"وہاں کیا چیزیں پڑی رہتی ہیں؟"

"چکّی۔"

"بس؟"

"رات کو یہ بکریاں بھی وہیں رہتی ہیں۔"

"اچھا تو اگر میں تمہارے پاس رہنے لگوں تو تم برا تو نہ مانو گے؟"

ہیرا اس سوال کا جواب دینے کی بجائے حیرت سے اس کا منہ تکنے لگا اور پھر کھسیانی سی ہنسی کے ساتھ سر جھکا لیا۔

"چلوں تمہارے ساتھ؟" پیرو نے پوچھا۔

"چلو۔" ہیرے نے بیلوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا' اور یہ ننھا سا قافلہ کچھ دیر کے بعد گاؤں میں داخل ہوا۔

دیر تک یہ بات ہیرے کی ماں کی سمجھ میں نہ آئی کہ ایک زمیندار کمیوں کے گھر کیسے رہ سکے گا؟ کموں بھی یہ راز سمجھنے سے قاصر تھی اور خود ہیرا بھی کہنیوں کو گھٹنوں پر ٹیکے اور ہتھیلیوں میں چہرے کو رکھے عجیب گو مگو کے عالم میں غرق تھا۔ پیرو کچھ دیر تک تو بیلوں کی رسّیاں تھامے چپ چاپ کھڑا رہا اور جب سارے گھر کو مبہوت دیکھا تو بولا۔ "یہ کوئی عجیب بات نہیں۔ ہم سب مسلمان ہیں اس لئے ہم سب ایک ہیں۔ میں نے ایک درخواست کی ہے۔ تم مان لو تو تمہیں دعا دوں گا۔ اور اگر تم نہ مانو تو خدا کی اتنی کھلی زمین تو ہے ہی۔ بسر

کر لوں گا۔ میں تو اپنا گھر سمجھ کر تمہارے ہاں آنکلا تھا۔"

بڑھیا بولی۔ "میرے بیٹے' بات یہ ہے کہ یہ بڑی عجیب سی بات ہے کہ ایک زمیندار ایک دھوبی کے گھر میں رہے! لوگ باتیں بنائیں گے اور تمہیں کوسیں گے۔ تمہارا مذاق اڑائیں گے۔ تم پر پھبتیاں کسیں گے۔ ورنہ ہم تو سب تمہارے خادم ہیں۔ تمہارا باپ خدا اسے کروٹ کروٹ جنّت نصیب کرے ہمارا بڑا سہارا تھا۔ خدا بخشے کموں کے باپ کو جب کبھی کوئی ضرورت پیش آئی' فوراً اُدھر ہی بھاگا' اور جھولی بھر لایا۔ وقت وقت کی بات ہے۔ کل گاؤں بھر میں تم ہی تم تھے اور آج تم دو بیلوں کے ٹھور ٹھکانے کے لئے اپنے غریب دھوبیوں کے ہاں آئے ہو۔ خوشی سے رہو۔ ہماری آنکھوں میں بسو مگر دیکھو' ہم کوڑی کوڑی کے محتاج ہیں۔ بکریوں کا دودھ بیچ کر گزارا کرتے ہیں۔ تم زمینداروں کی تو ننھی ننھی باتیں بڑی بڑی دشمنیوں میں بدل جاتی ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ گیہوں کے ساتھ گھُن بھی پس جائے۔"

اور بڑھیا نے ہیرے کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

کموں کی آنکھوں کی گردش اور پلکوں کے بار بار کا جھکاؤ اپنی ماں کی ہر بات کی تائید کر رہا تھا اور ہیرا مٹی کے پیالے میں پانی پیتے ہوئے کنکھیوں سے پیرو کو دیکھ رہا تھا' جو جہاندیدہ بڑھیا کی باتوں کو نہایت غور سے سنتا رہا۔ اور جب بڑھیا منتظر نظروں سے اُسے دیکھنے لگی' تو بولا۔ "میں تمہیں اجاڑنے نہیں آیا۔ میں اپنے آپ کے لئے پھانسی کا تختہ قبول کر سکتا ہوں مگر اپنی وجہ سے تم پر ایک ذرا سی آنچ بھی نہ آنے دوں گا۔ لیکن یہ جو تم سب کے چہرے اتر گئے ہیں، اس سے میں نے..." وہ بہت کچھ کہنا چاہتا تھا — مگر اب بڑھیا کموں کو چھپّر صاف کرنے کی ہدایت دے رہی تھی اور ہیرے کو حکم مل چکا تھا کہ بکریوں کے کھونٹے چھپّر سے اُکھیڑ کر پوربی دیوار کے قریب گاڑ دے۔

چند ہی روز میں پیرو اِس گھر کا برسوں پرانا فرد بن کر رہ گیا۔ چوپال

پر چہ میگوئیاں ہوئیں، چوراہوں پر قصّے چھڑے، بزرگوں نے پیرو کو "صحبت کے اثر" پر وعظ سنائے، لیکن پیرو، جو پہلے محض مکان اور بیلوں کی عدم مناسبت کے وہم سے یہاں آیا تھا، اب دھوبنوں اور ننھے دھوبی کی محبت اور خدمت سے اِس قدر مانوس اور مسحور ہو چکا تھا کہ کوئی طاقت اسے اپنے ارادے سے منحرف نہ کر سکی۔

ایک مرتبہ چند نوجوانوں نے کمّوں دھوبن کا ذکر چھیڑتے ہوئے کہا۔ "دو دو گاگریں تو خیر ہر لڑکی اٹھاتی ہے، مگر کمّوں تین گاگروں کے بغیر رکتی ہی نہیں۔ اور پھر تین بھری ہوئی گاگروں کے بوجھ تلے جب اس کا سینہ تھل تھل ناچتا ہے اور اس کے بھرے بھرے کولہے چکّی کے پاٹوں کی طرح ——" اور قریب ہی بیٹھے ہوئے پیرو نے نوجوان کے ایک تھپڑ جڑ دیا۔ نوجوان پیرو سے گتھم گتھا ہوگئے۔ چند لوگوں نے بیچ بچاؤ کرا لیا۔ پیرو کے بہت چوٹیں آئیں مگر ایک فائدہ ضرور ہوا۔ اب لوگ پیرو کے سامنے کمّوں کا ذکر کرتے ہوئے ڈرتے تھے، اور پیرو سارا دن ہل چلانے کے بعد واپس آ کر گلی کے قریب ایک پست سی کوٹھڑی کی چھت پر کھاٹ ڈالے پڑا رہتا تھا۔ دھوبیوں کے پاس رہنا ہی گاؤں کے زمینداروں کے نزدیک ناقابلِ معافی جرم تھا۔ اب ایک ہم رتبہ نوجوان کے منہ پر چانٹا جلتی پر تیل بن کر گرا؛ پیرو گاؤں بھر میں اچھوت بن کر رہ گیا۔ اچھی اچھی دور اندیش بوڑھیوں نے کوئی بَر ڈھونڈنے کی کوشش کی، کہ اس سے کوّا بنا لیا جائے۔ مگر ان کے پلّے کچھ نہ پڑا، اور تھوڑے ہی عرصہ بعد لوگ دو مختلف سماجی طبقات کے اِس عجیب و غریب اختلاط کو فراموش کر بیٹھے۔

طلوعِ آفتاب کے ساتھ ہی وہ بیلوں، بکریوں کو ساتھ لے کر اپنی زمینوں پر چلا جاتا۔ بکریاں ڈھیریوں پر چرتی رہتیں، اور وہ ہل چلاتا رہتا۔ جن دنوں فارغ ہوتا تو چٹانوں پر چادر بچھا کر لیٹ جاتا۔ سفیدے چرتے ہوئے دور نکل جاتے۔ جھاڑیوں میں ہوائیں گاتیں۔ گنجان گھاس کے قطعوں میں بینے

چیختے۔ فضا میں بٹی ہوئی بدلیاں غیر محسوس رفتار سے گھومتیں۔ کبھی سورج کو اپنی اوٹ میں لے لیتیں، اور اچانک ہوا کے جھونکوں میں خنکی بس جاتی۔ کبھی چھٹی چھٹی بدلیاں سورج پر سے گزرتیں تو دھوپ چھاؤں کا ایک مسلسل کھیل شروع ہو جاتا، اور پیرو دیکھتا کہ اس کے ایک سفیدے پر دھوپ ہے تو دوسرے پر چھاؤں ہے اور دھوپ چھاؤں کی یہ لہریں زمین پر رواں دواں ہیں۔ اب ڈھیری سے اتر رہی ہیں تو اب کھیتوں پر تیر رہی ہیں۔ اب درختوں کے جُھنڈوں میں پھنسی پھنسی سامنے کی پہاڑی پر چڑھ کر پرلی طرف اُتر گئی ہیں، اور اِدھر کی ڈھیری سے اِن لہروں کا ایک اور سیلاب اُمڈ پڑا ہے۔ جن دنوں آسمان بالکل صاف ہوتا اور سورج لوہار کی دکان پر تپتے ہوئے لوہے کی طرح لشکارے مارتا؛ جب صاف چٹانیں سلگنے لگتیں اور بیریوں کے پتے مرجھا سے جاتے، گھاس کے قطعوں میں بینے چپ سادھ لیتے اور ہواؤں کے گیت آہوں میں بدل جاتے، تو وہ اپنے سفیدوں کو بیریوں کی چھاؤں میں لے آتا۔ اِدھر اُدھر سے گھاس کاٹ کر ان کے آگے ڈھیر کر دیتا۔ ان کے سامنے بیٹھ کر انہیں چرتا دیکھتا اور پھر اگر جنگل کی ارغوانی اور عنابی مکھیاں بیلوں کے چکنے جسموں پر بیٹھ کر اپنے پر سنوارنے لگتیں اور بیل خوبصورت دُموں کے مور چھل ہلاتے، مکھیاں پیٹھ سے اڑ کر ماتھے پر اور ماتھے سے اڑ کر پیٹ پر بیٹھتیں اور وہ پریشانی میں اپنے کُھر زمین پر مارتے تو پیرو اپنے سفیدوں کی تکلیف دیکھ کر بے چین ہو جاتا۔ مکھیوں کے تعاقب میں بندروں کی طرح اُچھلتا کودتا رہتا، اور پھر ہانپتا ہوا بیلوں کی گردنوں میں باہیں ڈال کر زور زور سے ہنستا۔

اَسوج کی ابتداء میں اس نے دو کھیتوں میں نہایت محنت سے گندم کی نلائی کی اور ایک کھیت کو اگلے جیٹھ تک ہل چلانے کے لیے خالی چھوڑ دیا۔ اب اس کا زیادہ وقت بیکار پڑے پڑے گزرتا۔ اُنہی دنوں ایک روز اچانک اسے احساس ہوا کہ اس کا وجود دو قابلِ رشک بیلوں اور شاداب زمینوں کا مالک

ہوتے ہوئے بھی نامکمل ہے۔ اس میں کسی چیز کی کمی ہے اور یہ کمی اس کے ماحول کے کسی گوشے میں ہے۔ نئے مکان کے بارے میں تو وہ کئی مرتبہ سوچ چکا تھا کہ اپنی ہی زمین پر اگی ہوئی بیریوں اور بکائنوں سے چھت بن سکتی ہے۔ اچھے سفید پتھر ڈھیری کی چوٹی پر موجود ہیں۔ گارا مٹی کا انتظام وہ خود اور رمیرا اور کمّوں سب مل کے کرلیں گے۔ اس طرح مکان تو تیار ہو جائے گا، مگر یہ سفیدے! ــــ یقیناً" یہ سفیدے نہیں رہیں گے۔ جب وہ اپنے اس ارادے کو اس وہم کے زیرِ اثر کئی مرتبہ رد کر چکا تھا، تو آخر اس کے دل میں وہ کونسی آرزو تھی جو اسے چٹان پر لیٹے لیٹے اِتنی طویل اور کرب آمیز لذت سے بھرپور انگڑائیاں لینے پر مجبور کرتی تھی۔ گھاس کاٹتے وقت درانتی کی چر چر اور گھاس کی خوشبو، اور کھیتوں کی سنجیدہ وسعت اور ہواؤں کی پُراسرار سرگوشیاں، سب کچھ گھُل مِل کر اس پر کسل بن کر ٹوٹ پڑتا اور وہ ہاتھ ڈھیلے چھوڑ کر کٹی ہوئی گھاس پر لیٹ جاتا؛ کروٹیں بدلتا، انگلیاں چٹخاتا، اور بیلوں کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرتے وقت ان کی گرم گرم ملائمت میں اپنے اعصاب کے تمام تاروں کو جھنجھناتا ہوا محسوس کرتا۔ لانبی گھاس کے نرم قوسی خوشے جب اس کے گالوں اور گردن سے مَس کرتے اور نیچے زمین کی معطر سیلن اس کے کپڑوں سے چھن کر جسم کے مساموں میں گھس جاتی، جب جوہڑ کے کنارے کائی کی جدول پر بھنبھیریاں منڈلاتیں اور آس پاس گداز دَلدل میں ٹخنوں تک پاؤں چھپائے ننھے ننھے آبی کیڑوں کو تنکوں پر اٹھانے کی کوشش کرتا، تو اس کے دماغ میں الاؤ سے بھڑک اٹھتے، کنپٹیوں کے قریب بِینے سے چلّا اٹھتے، ماتھے پر لٹکتے ہوئے پتّوں کا مَس اس کے سارے جسم میں جھرجھری سی دوڑا دیتا؛ اور جب ایک روز خاکی رنگ کے ایک خرگوش کے تعاقب میں وہ لانبی گھاس میں نالیوں پر سے پھاندتا اور بیریوں بکائنوں کی شاخوں سے بچتا خرگوش کی پناہ گاہ پر جا کودا اور جھپٹ کر اس کے لمبے کان دبوچ لئے، تو اس کے نرم بالوں اور گرم جسم کے مَس نے اس کے دل و

دماغ کے بعید ترین گوشوں میں ایک کپکپی سی طاری کر دی۔

اُسی شام کو جب کمّوں اس کے پاس کھانا لے کر آئی اور اس کے ہاتھ سے پیالہ لیتے ہوئے کمّوں کے ہاتھ سے اس کی انگلیاں چھُو گئیں تو خرگوش کے جسم کا مَس اور رَس اس کے خیالوں میں رچ گیا، لیکن اچانک خیانت کے شدید احساس نے اسے سنبھالا دیا، اور وہ بولا۔ "کمّوں ہر روز تم ہی کیوں کھانا لاتی ہو میرے پاس، رمیرا کہاں ہے؟"

"کھانا کھا رہا ہے۔" کمّوں بولی۔

"مَیں خود اٹھا لاتا کھانا۔" پیرو نے ضمیر کی چٹکیوں سے تنگ آ کر کہا۔

رمیرے کی ماں ہنڈیا میں چمچا بجا کر بولی۔ "کیوں بیٹا، خیریت تو ہے نا؟ کمّوں سے کوئی قصور تو نہیں ہوا؟ کیوں ری کمّوں؟"

کمّوں بے چاری ٹھوڑی کو ہاتھ میں لئے آنکھیں جھپکائے جا رہی تھی۔ بولی۔ "پر ماں یہ تو بے قصور بگڑ رہے ہیں مجھ سے، پوچھ لو ان سے۔"

پیرو نے بات کو بڑھتے دیکھا تو چونک کر بولا۔ "اور میں نے کب کہا کہ تم نے قصور کیا ہے۔ ویسے ہی کہہ دیا تھا۔ چھوٹے بھائی ہی تو کام کرتے ہیں اکثر۔ رمیرا مزے اڑائے اور کمّوں جُتی پھرے دن بھر۔ آخر کیوں! او رمیرے؟"

رمیرا لقمے کو زبان کی نوک پر چڑھا کر جبڑے کے ایک حصے میں دبا کر بولا۔ "کمّوں بھی تو آپ سے چھوٹی ہے۔"

"اور تم کمّوں سے چھوٹے ہو۔" پیرو اس معاملے کو مذاق میں اڑانے پر تل گیا تھا۔

سب ایک ساتھ ہنسے اور جب کمّوں ایک رکابی میں پیاز کتر کر لے آئی تو پیرو نے کہا۔ "یہاں رکھ دے۔"

"یہاں سے کھسک جائے گی رکابی۔" کموں بولی۔

"تو پھر میرے سر پر رکھ دے۔" پیرو نے کہا۔

"یہ لیجئے۔" اور ڈگمگاتی ہوئی رکابی کو پیرو کے سر پر چھوڑ کر کموں ہرنی کی سی قلانچیں بھرتی میرے کے پاس آگری جو اس سے پہلے ہی ہنسی سے لوٹ پوٹ ہو رہا تھا؛ اور بڑھیا ہنڈیا کے پیندے پر لقمہ پھیرتے ہوئے یوں ہنس رہی تھی جیسے شریر بچوں کے چھیڑنے سے بہت سی بطخیں ایک ساتھ واویلا مچاتی ہیں!

پیرو کو اُن نوجوانوں کی پھبتیاں اچھی طرح یاد تھیں جو کموّں کے سینے اور کولہوں کی باتیں کرتے مغلظ گالیاں بکتے اور پیرو کی نئی قیام گاہ کی داخلی وجہ کے بارے میں کموّں کے متعلق عجیب عجیب خیال آرائیاں کرتے۔ اُسے اِس بات کا بھی احساس تھا کہ اوّل اوّل بڑے بوڑھوں نے دھوبیوں کے گھر میں اس کے قیام کو شک کی نظروں سے دیکھا تھا اور بڑی بڑی دوہری جھرّیوں والی کٹنیاں اس کے پیچھے لگا دی تھیں کہ وہ اُدھر کموّں سے ہنس کر بات کرے اِدھر سارے گاؤں میں ڈھنڈورا پٹوا دیا جائے۔ آخر ایک شریف قبیلے کے نوجوان کا ایک پنچ ذات کی عورتوں کے ساتھ رہنے بسنے کی کوئی وجہ بھی تو ہونی چاہیے۔ یہ کیا فضول بات ہے کہ پیرو کے پاس مکان تھا تو بیل نہیں تھے، اور اب اگر وہ مکان بنوالے گا تو بیل نہیں رہیں گے۔ اصل میں اِس سارے ناٹک کے پس پردہ کموں کی گدرائی ہوئی جوانی، اس کی باداموں کی سی آنکھیں اور شکرپارے کے سے ہونٹ ہیں۔ سفیدے تو چوپال کی ڈیوڑھی تلے بھی بڑے آرام سے رہ سکتے تھے۔

اِن احساسات کے علاوہ پیرو کے دل میں بڑھیا کا بڑا احترام تھا، اور یہ احترام محبت اور خوف کے یکساں جذبات سے مرکب تھا۔ وہ اس بڑھیا کے اعتماد کو ٹھیس پہنچانے سے غارت ہو جانا بہتر سمجھتا تھا؛ اور پھر کون جانے کموّں اس کے بارے میں کیا خیال رکھتی ہے! بلاشبہ وہ اس کے کپڑے دھوتی ہے، اس کے غسل کے لئے پنگھٹ اور کنویں سے تین تین گاگریں اٹھالاتی ہے، اس کے لئے مٹی کے برتنوں کی جگہ تام چینی کی رکابیاں استعمال کرتی ہے، اس سے مسکرا

کر بات کرتی ہے، اس سے مذاق بھی کر لیتی ہے؛ اور ایک بار تو اس نے پیرو کی ایک مونچھ پکڑ کر یہ بھی کہہ دیا ہے۔ "یہ۔ارے یہ دیکھو،میرے۔ یہ دیکھو، کالے بالوں میں سنہری تار، بالکل جیسے گھنیرے بادلوں میں کوندا لپکتا ہے۔" پیرو یہ بات سن کر صرف مسکرا دیا تھا۔ اپنے گالوں پر کموں کے ہاتھ کے مَس، اپنی کنپٹیوں پر کموں کی گرم سانسوں اور اپنے ماتھے پر لٹکتی ہوئی کموں کی ایک دور درازلٹ کے سحر کو اس نے قطعاً" محسوس نہیں کیا تھا، لیکن اب تو اسوج کے آخری دن تھے، گرمیاں اور سردیاں گلے مل رہی تھیں، سوکھے ٹھنٹھوں کی پھننگیں بھی ہری بھری نظر آتی تھیں، منڈیروں پر سبزہ اگ آیا تھا، ڈھیریوں پر عجیب عجیب رنگوں کے بے شمار پھولوں نے بساطی کی دکان سجا رکھی تھی، اور جب سفیدے اِن کے گھیرے میں گھومتے تھے، اور میرے کی بکریاں ان پر دوڑتی تھیں، تو پیرو اچھل پڑتا تھا۔ بیریوں کی ٹہنیوں سے لٹکتا تھا۔ بندروں کی سی قلابازیاں کھا کر پھولوں پر جاگرتا تھا۔ اُن پر لوٹ پوٹ ہوتا جھاڑیوں میں پھنس جاتا تھا اور پھر سفیدوں سے لپٹ کر ان کے ماتھے کے عین وسط میں بڑے ضخیم بوسے جڑتا تھا۔ ان کے پٹھوں پر ہاتھ پھیر کر کہتا تھا۔ "میرے خزانو، میرے ساتھیو، میرے دوستو۔" وہ ہمیشہ یہی کہا کرتا تھا، لیکن اس بدلتی رُت کے پُراسرار سلونے پن نے تو اس کے ان الفاظ میں ایک لرزش، ایک دھڑکن، بلکہ ایک کھولاؤ سا پیدا کر دیا تھا، اور اس کربناک لذت کا راز اب کھلا، کہ اس سارے اعصابی انتشار میں کموں کا ہاتھ تھا۔

اُس رات وہ کوٹھڑی کی چھت پر کمبل اوڑھ کر لیٹا تو نیند نے ایک دم ہلّہ بول دیا۔ پہاڑوں کی چوٹیوں پر، دیودار کے جنگلوں میں، برفیلی ہوا کے فراٹوں کی طرح صرف اس کے دماغ میں نہیں، سارے جسم میں ایک مسلسل گونج پیدا ہوئی۔ کھٹولا ڈولنے لگا اور چھت جادو کی دری کی طرح اوپر ابھر کر ہنڈولا سا بن گئی۔ اس غنودگی میں اس نے اپنے ماضی، اور حال پر پرواز کی، اور

لپک کر اپنے مستقبل کا اُفق بھی دیکھ آیا۔ بار بار اس نے ارادہ کیا کہ کمّوں کی
ماں سے یہ بات کہہ دے اور کمّوں سے شادی کر کے اس ذہنی ٹنٹے کو ختم کر
دے۔ آخر انسانوں میں جماعت بندیاں کیوں ہیں۔ وہ کمّوں کو چاہتا تھا' اور شاید
کمّوں کو بھی اِس چاہت پر اعتراض نہ ہو۔ پھر اُس کی ماں' اور اُس کا گاؤں اور
اُس کا سماج کیوں اس کی راہ میں حائل ہونے لگا؛ مگر یہ ارادہ فوراً ہی رد کر دیا
گیا۔ اس کے جذبۂ غیرت نے انگڑائی لی۔ آخر لوگوں کے شکوک سچے نکلیں گے
نا۔ یہی لفنگے اس کے سامنے ہنسیں گے' قہقہے لگائیں گے' اور کمّوں کی ماں کو
بوڑھی کُٹنیاں ٹھوکے دے دے کر کہیں گی۔ "اری کبھی کسی نے آستین میں
بھی سانپ پالا ہے!" اور پھر زمیندار اور دھوبن کے اس معاشقے کا قصّہ نون
مرچ کی تہوں پر تہیں قبول کرتا گردو پیش سیلاب کی طرح چھا جائے گا اور لوگ
رپیرو کے باپ اور کمّوں کے باپ اور پھر ان کی سات پشتوں کی تاریخ سے کیڑے
نکالیں گے۔ وہ جدھر جائیں گے' انگلیاں اٹھیں گی' اور آوازیں آئیں گی؛ یہی
ہے وہ ریاکار نوجوان جو مہمان بن کر ایک گھر میں گھسا اور اچکا بن کر نکلا اور یہی
ہے وہ کمّوں دھوبن جو ماں کے پیٹ پر لات مار کر ایک زمیندار لونڈے پر ریجھ
گئی؛ صرف اس لئے کہ اس کے پاس دو تگڑے بیل تھے' اور اس کا رنگ عام
لوگوں سے ذرا کھُلتا ہوا تھا۔

نیند کی ابتدا بڑی لطیف تھی' لیکن یہ کوسنے اور آوازے' گرج اور
کڑک بن کر چاروں طرف سے اُبھرے اور معاً رپیرو کو احساس ہوا کہ جب سے
کھٹولے پر لیٹا ہے' اس کی آنکھیں کھلی ہیں' اس کا ہاتھ سر کے نیچے پڑے پڑے
سن ہو گیا ہے اور اس کے ماتھے پر ایک مچھر نے جگہ جگہ سے کاٹا ہے اور صحن
سے کمّوں کی آواز آ رہی ہے۔ "ہاں تو میرے' اب کہانی بڑے بھدے موڑ پر
ہے۔ شہزادی ساری بات بھانپ گئی۔ اپنی ماں کو سارا ماجرا سنایا۔ اس نے
شہزادے کو اپنے پاس بلایا اور ایک چھُرا اس کے ہاتھ میں تھما کر کہا "شہزادے!

میری بیٹی کی عزت بگاڑنے سے پہلے میرا گلا کاٹ دے تاکہ ——"

رپیرو تڑپ کر اٹھ بیٹھا اور پکارا۔ "میرے' پانی کا ایک گلاس لانا بھائی"

"ارے بھیّا تو جاگ رہا ہے۔" میرا بولا۔

اور کمّوں نے بستر سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "تو لیٹا رہ' مَیں دیئے آتی ہوں
پانی۔"

اور رپیرو کے اِتنا پسینہ چھُوٹا' کہ کمّوں کے قریب آ جانے سے ہوا کی
ننھی سی لہر نے بھی اسے کپکپا کر رکھ دیا!

خیالوں کے اِس اُتار چڑھاؤ' نزدیک و دور کے اِس انوکھے کھیل نے
رپیرو کو ایک ہی دن میں مضمحل کر دیا۔ دوسرے روز شام کو جب وہ سفیدوں کی
دُمیں مروڑتا بکریاں ہانکتا گھر آیا' تو بہت نڈھال اور بجھا بجھا سا تھا۔ اس کی ہر
حرکت میں بیزاری تھی۔ اُس شام کو اس نے سفیدوں کے تھانوں کو بھی صاف
نہ کیا۔ پھاوڑا اٹھایا اور پھر وہیں دیوار سے لگا دیا۔ کمّوں ہی اس کے پاس کھانا
لائی۔ کمّوں ہی نے اسے پانی پلایا۔ کمّوں ہی نے اس کی کھاٹ چھت پر رکھی اور
کوٹھڑی کی چھت پر سے لٹک کر اترتے ہوئے بولی۔ "خوب آرام کیجئے' آج
آپ کچھ سست ہیں۔"

بڑھیا' کمّوں سے رپیرو کی سستی اور خاموشی کا حال سن کر دوڑی آئی۔
کئی جوشاندوں کے اجزائے ترکیبی ایک سانس میں گن ڈالے۔ مالش کی تجویز
پیش کی۔ کدّو کے ٹکڑوں سے تلوے مَلنے کو اس نے سب سے بہتر خیال کیا اور
پھر رپیرو کی رائے کا انتظار کئے بغیر پڑوس سے کدّو ادھار مانگنے چلی۔ اب کے رپیرو
چلّا اٹھا۔ امّاں تم خواہ مخواہ ہلکان ہو رہی ہو' موسم بدل رہا ہے نا اسی لئے طبیعت
مرجھا سی گئی ہے۔ اور پھر آج سفیدوں نے مجھے بہت تنگ کیا۔ بچھڑوں کی طرح
اچھلتے کودتے اِتنی دور نکل گئے کہ بھاگتے بھاگتے میری پنڈلیوں کے پٹھے سوج
رہے ہیں۔"

"اِسی لئے تو میں کدو لینے چلی ہوں۔" بڑھیا دروازے کے قریب سے بولی، اور لپک کر پڑوس میں جا پہنچی۔ میرا آخری لقمہ چباتا کھٹولے کی پائنتی پر آبیٹھا اور کموں ایک طرف کھڑی ہاتھ مَلتی رہی کہ اچانک پیرو بولا۔ "کموں کھڑی کیوں ہو؟ بیٹھ جاؤ۔"

اور کموں فوراً بیٹھ گئی، کلدار گڑیا کی طرح، جیسے اس کا اپنا کوئی ارادہ نہیں، جیسے وہ پیرو کے حکم کی منتظر تھی۔ اس کے ہونٹ ذرا سے کھلے تھے، پلکیں بہت دیر کے بعد جھپکتی تھیں، اور وہ برابر ہولے ہولے ہاتھ مَلے جا رہی تھی۔ اِتنے میں بڑھیا کدو کا ایک ٹکڑا لے آئی۔ چھُری کی تلاش میں برتن پر برتن دے مارا۔ دہلیز پر سے پھسل کر منہ کے بل گری اور کدو دو ہو کے رہ گیا۔ زخموں پر "توبہ اللہ" کا مرہم لگاتی اٹھی۔ ہرنی کی طرح اُچھل کر کوٹھڑی کی چھت پر آ رہی۔ ایک ٹکڑا میرے کے ہاتھ میں تھمایا۔ دوسرا کموں کے حوالے کیا اور کانپتی ہوئی آواز میں بولی۔ "لو خوب رگڑو میرے بیٹے کے تلوے، اِتنا رگڑو کہ کدو کا چھلکا پیاز کے پردے کی طرح پتلا ہو جائے۔ گرمی چڑھ گئی ہے دماغ کی طرف۔ اِدھر میں ہتھیلیاں ملتی ہوں اپنے بیٹے کی۔ لو، یہاں پائنتی پر اٹک جاؤ، اے میرے۔ کھاٹ پر کود نہیں۔ کموں، تُو اُدھر مڑ کر بیٹھ۔ یوں۔ اور ہاں۔ اب، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، لقمان حکیم حکمت کا بادشاہ۔ صحت شفا کُل بلائیں دفع۔" پیرو تیزی سے چلتے ہوئے ہاتھوں میں محصور ہو کر رہ گیا تھا۔ اس نے ہزار منتیں کیں، ایک بار جھوٹ موٹ غصے کا اظہار بھی کیا۔ قسم بھی کھائی اور کہتا رہا۔ "ارے میرے، اے کموں، اے خدا کے واسطے مجھ پر رحم کرو۔ مَیں بیمار نہیں ہوں، مَیں سچ مچ بیمار نہیں ہوں۔ مَیں نے تو ویسے ہی بہانہ کیا تھا بیماری کا۔ ارے اماں۔ میرا سر بالکل ٹھیک ہے، میں سارا دن بیریوں کے سایوں میں پڑا رہا ہوں۔ سفیدے ایک ہی جگہ چرتے رہے، اماں۔ اے اماں۔"

"جی میرے بچے۔" بڑھیا بولی۔ "جی۔ تُو سدا جیتا رہے۔ تُو سدا سکھ چین سے رہے۔ تیرے تلووں میں کانٹا تک نہ چبھے۔ تیرے نصیبوں میں چاند ستارے چمکیں۔ اللہ اور اس کے رسولؐ کی تجھ پر رحمتیں ہوں۔ اے میرے تُو سست پڑ رہا ہے۔ دیکھ اپنی بہن کو، بال لٹک کر چہرے پر پڑ رہے ہیں پر ایک پل کے لئے بھی نہیں رکی۔ ہاتھ رکے تو تلوے سے نکلتی ہوئی گرمی پھر اوپر لپک جاتی ہے۔ زور سے۔ شاباش۔ اور دیکھ میرے بچے، تو چپ سادھے پڑا رہ۔ ورنہ صبح کو میں خود ہی سفیدوں کو چرانے چلی جاؤں گی۔"

"میں لے جاؤں گی۔" ہانپتی ہوئی کموں بولی۔

میرا بھڑک اٹھا۔ "تُو کیوں لے جائے گی! بڑی چرواہی کہیں کی۔ میں لے جاؤں گا جی۔ کیوں بھیا؟"

لیکن پیرو کا وہ پاؤں تو تپ کر انگارہ بن چکا تھا جسے کموں اِتنی توجہ اور اِتنے شدید اور عمیق جذبۂ رفاقت سے مَل رہی تھی۔ کئی مرتبہ کموں کی انگلیوں نے اس کی پنڈلیوں کو جکڑ لیا۔ اس کے پاؤں کموں کی گود میں تھے اور بے ترتیب لٹیں پیرو کے ٹخنوں کو چھو رہی تھیں اور پسینے کے قطرے اس کی پنڈلی پر گر رہے تھے۔ کموں کی چوڑیاں بج رہی تھیں اور بڑھیا کا تانبے کا کنگن بار بار پیرو کی کلائی کی ہڈی سے ٹکرا کر اس کے سارے جسم میں ہلکے ہلکے درد کی لہر دوڑا دیتا تھا اور پھر ہولے ہولے اس کے حواس پر غنودگی چھانے لگی اور وہ سو گیا۔

صبح کا ستارہ دو نیزہ بلند تھا کہ اس کی آنکھ کھلی۔ اس کا سارا جسم تپ رہا تھا۔ تیز اور خنک ہوا کے باوجود اس کے چہرے کے کئی مقامات پر پسینے کی نمی موجود تھی۔ ایک سفیدے کے گلے سے گھنٹی ٹن سے بج کر خاموش ہو گئی، لیکن خاموشی کے باوجود اس اکلوتی ٹن کی پلٹے کھاتی لکیر بہت دیر تک فضا میں رواں ور قصاں رہی۔ ماحول کی پُراسرار کیفیت نے اسے جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ صحن پر

نظر دوڑا کر وہ بستر سے اٹھا۔ صحن میں ایک کھاٹ سے کموں اٹھی۔ لپک ک
چھت کے قریب آئی' اور نہایت ہراساں اور لرزاں لہجے میں بولی۔ "آپ
اٹھے کیوں؟ کچھ چاہیے؟ کوئی تکلیف تو نہیں آپ کو؟"

سفیدے کی گھنٹی ایک بار پھر ٹن سے بج اٹھی اور اس کی آواز
ڈوبتی لہر سرمئی فضا میں عُود کے دھوئیں کے سے حلقے بناتی پیرو کے چار طرف
منڈلانے لگی۔ ٹوٹتی رات کی ان راز بھری گھڑیوں میں کموں کو اپنی طرف ا
درجہ متوجہ پا کر پیرو سہم سا گیا اور پائنتی پر بیٹھ کر بولا۔ "تم سو جاؤ کموں' مَ
ٹھیک ہوں' بالکل ٹھیک ہوں' یوں ہی آنکھ کھل گئی تھی۔ جاؤ' تم سو جاؤ کموں
پر تمہاری آنکھ کیسے کھلی؟"

"میری آنکھ تو ایک پَل کے لئے بھی لگی ہو تو کافر ہو کر مروں۔ مَ
نے تو آج آپ کی کروٹیں تک گن لیں۔"

"پر تمہاری آنکھ کیوں نہ لگی؟"

"آپ جو بیمار تھے۔"

"میری بیماری سے تمہیں کیا۔"

کموں کی آواز کچھ بلند ہو گئی۔ "واہ جی۔ آپ کی بیماری سے میرا ک
واسطہ نہیں! کوئی واسطہ نہیں میرا! سچ مچ آپ ایسا ہی سمجھتے ہیں۔"

پیرو سنبھل بیٹھا۔ "تمہاری آواز بھرّا گئی ہے۔ تم نے غلط سمجھا۔
یہ مطلب نہیں تھا۔"

"تو پھر کیا مطلب تھا؟"

"میرا مطلب یہ تھا کہ ——" اچانک پیرو کو جیسے کسی نے نیند
جھنجھوڑ کر بیدار کر دیا ہے؛ اُس نے وحشت ناک انداز میں اٹھ کر سامنے دیک
اور پھر کموں کی کھاٹ پر نگاہیں دوڑا کر بولا۔ "کموں۔"

لیکن کموں تو اِس تمام گفتگو کے دوران میں اس کے قریب کھڑی ا

کا سر دباتی رہی تھی وہ مڑ کر پیرو کے سامنے آ گئی اور بولی۔ "جی' تو کیا مطلب تھا
آپ کا؟"

پیرو تیورا کر پیچھے ہٹا۔ "جاؤ' کموں' جاؤ' سو جاؤ' جاؤ۔" وہ چلّا اٹھا اور
کموں چھت پر سے چپ چاپ کودتی کھاٹ کی طرف چلی۔

"کیا بات ہے کموں؟" بڑھیا نے مَیلی چادر میں سے آواز دی۔

"کچھ نہیں ماں۔ پانی پینے اٹھی تھی۔"

اور پیرو جو پہلے ہی مخمصوں کی اتھاہ گہرائیوں میں' دلدل میں پھنسے
ہوئے کیکڑے کی طرح ہاتھ پَیر مار رہا تھا' کموں کے اس جواب سے شل ہو کر رہ
گیا۔ کموں نے اپنی ماں کو سچی بات کیوں نہ بتائی! —— اس نے بہانہ کیوں
تراشا! وہ جھوٹ کیوں بولی!

پُو پھٹی تو پیرو کو کموں سے' اس کے سارے گھر سے' گھر کی ہر چیز سے'
اِس ماحول سے' اِس گاؤں سے خوف سا محسوس ہونے لگا۔ وہ کھسک کر بستر میں
سے نکلا۔ بکریوں کے دوہے جانے میں ابھی کافی دیر تھی۔ بڑھیا' کموں اور میرا
سب سو رہے تھے۔ اس نے سفیدوں کی گھنٹیاں نہایت احتیاط سے اتاریں۔
گھنٹیوں کی زبانوں کو پکڑ کر بیل کھولے' اور کھیتوں کو چل دیا۔

کھیتوں کی ملحقہ ڈھلان پر پہنچ کر اس نے خلافِ معمول سفیدوں سے
کوئی بات کئے بغیر اپنے آپ کو ایک بیری کے قریب گرا دیا۔ سفیدے متحیّر و
مبہوت اس کے آس پاس گھومتے رہے؛ کافی دیر تک وہ کان کھڑے کئے اپنے
مالک کو گھورتے' پریشانی میں کُھر جھٹک کر اور کان پھڑ پھڑا کر اس کے قریب
آتے' اور گُم سُم کھڑے رہتے۔ نیلی اور اُودی مکھیوں کو اڑانے کے لیے انہوں
نے دُمیں تک نہ ہلائیں۔ گھاس کی طرف متوجہ ہوتے مگر بے دلی سے' جیسے سیر
ہیں اور چرتے چرتے تھک چکے ہیں؛ لیکن پیرو جسم کو نہایت بے ترتیبی سے
پھیلائے' ایک ہی حالت میں بیری کے نیچے پڑا رہا۔ سورج ابھر کر کافی اونچا ہو

گیا۔ بیریوں کے سائے ڈھلان کی چوٹی سے نیچے کھسک آئے۔ گھاس میں رنگ رنگ کے ٹِڈے پُھدکنے لگے۔ ننھی ننھی چڑیاں، شوخ گُلدمیں اور خوش گلو ممولے شاخوں پر بیٹھ کر اپنے روز کے ساتھی کو دیکھتے اور چرر سے گیندوں کی طرح اوپر ابھر کر خلا میں متحرک دھبے بن کر غائب ہو جاتے۔ بڑے راستے سے چند دہقانوں نے پلٹ پلٹ کر پیرو کو دیکھنے کی کوشش کی۔ چند لوگوں نے اسے پکارا بھی، مگر پیرو اپنے احساس اور اپنے ضمیر، اپنے ماحول اور اپنے نظام حیات کے بارے میں سوچتا رہا اور جب سوچوں کا ایک انبار لگ گیا اور اس کا دماغ اس بوجھ تلے دب کر کراہنے لگا، تو وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا، اور خشک پتّوں کو ایک ہاتھ سے تھپتھپاتے ہوئے بولا۔ "کیا کروں، آخر کیا کروں مَیں ——" اور بیل اس کے قریب آ گئے۔ گُلدُمیں اور ممولے کہیں سے بوندوں کی طرح ٹپک پڑے، بینے چِلّا اٹھے، ٹڈے اپنے رنگین پر پھیلا کر کمانوں کے سے خم بناتے اُڑے، بیریوں کے سائے سرسرائے اور زندگی رقصاں ہو گئی۔

لیکن اپنے سوال کے جواب نہ پا کر وہ پھر اُسی طرح ڈھیر ہو گیا۔ یہ شدید احساس اسے مارے ڈالتا تھا کہ وہ کمّوں کو چاہتا ہے، اس کی بڑی بڑی آنکھوں کے سرمئی پپوٹے، اس کے سانولے رنگ میں گہری گلابی جھلکیاں، اس کے لانبے سیدھے بال، اس کی بھری بھری کلائیوں کے جوڑوں پر کہنیوں کے قریب گوشت کے لرزاں گڑھے، اس کی بے پروایانہ چال، جو ٹانگوں کی بجائے باہوں کی آزاد اور مدوّر حرکتوں پر منحصر تھی، اس کی مسکراہٹوں میں معصومیت کی روشنی، جیسے شفق آلود بدلی کے کسی شگاف سے چھنتی ہوئی شعاعیں، اور پھر اس کی بھولی بھالی محبت، اور بے غرض توجہ فرمائی، یہ سب کچھ اسے اچانک ایک ہی دن میں سرمایۂ حیات معلوم ہونے لگا تھا۔ اور ان سے کترا کے نکل جانا اس کے لیے اتنا ہی مشکل تھا جتنا سفیدوں کو کسی کے ہاتھ بیچ ڈالنا۔ لیکن اسے تمام عمر اس گاؤں میں رہنا تھا اور وہ جانتا تھا کہ ایک دھوبن سے، اپنی میزبان دھوبن

سے بیاہ رچا کر وہ عمر بھر کے لیے سارے گاؤں میں نکّو بن کر رہ جائے گا، اور پھر یہ حرکت حقیقت میں تھی ہی بہت قابلِ اعتراض۔ جس بڑھیا نے اسے اتنا عرصہ پناہ دی، جس نے اس سے بیٹوں کی سی محبت کی، جس کی اولاد اس کی زر خرید خادم بن کر رہی، اُسے اِس بڑھاپے کے عالم میں یہ صدمہ کہیں کا نہ رکھے گا۔ اگر ایک زمیندار کے لیے دھوبن کا رشتہ قابلِ اعتراض ہے، تو دھوبیوں کے نزدیک ایک دھوبن کا کسی زمیندار کے ہاتھوں بِک جانا کہاں جائز تھا۔ ہر قوم کی عزّت و آبرو کے الگ الگ معیار ہیں، اور کمّوں سے شادی رچانے کے بعد وہ ایک اپنے ہی لئے نہیں، بلکہ خود کمّوں، کمّوں کی ماں اور کمّوں کے معصوم بھائی کی تباہی کا باعث بن جائے گا؛ لیکن ان سب افکار کی تہوں میں دبکا ہوا ایک خیال بلکہ ایک ارادہ بار بار اس کے دماغ کی طرف اچھل کر اس کے اعصاب میں کھلبلی مچا دیتا۔ وہ نکیلے پتھروں اور ٹوٹی ہوئی خشک خار دار ٹہنیوں سے بے پروا ہو کر کروٹوں پر کروٹیں بدلتا، اور پھر اٹھ کر سامنے خلا میں گھورتا رہ جاتا۔

ایک بار اس نے لمبے پٹوں کو ایک جھٹکے سے ماتھے پر سے ہٹایا اور اٹھا، تو سامنے سے اُسے کمّوں کی ماں آتی نظر آئی۔ اس کے آگے آگے دونوں بکریاں تھیں۔ اور وہ کھیتوں اور ان کی ملحقہ ڈھلانوں پر نگاہیں دوڑاتی تیز تیز چلی آ رہی تھی۔ پیرو نے ایک مرتبہ تو کہیں چھپ جانے کی ٹھانی، مگر بڑھیا قریب آ چکی تھی۔ اس کا منہ کھلا تھا۔ آنکھوں کے کناروں پر شکنیں معمول سے زیادہ تھیں۔ وہ ہاتھوں کو بار بار ملتی تھی اور ایک بھوسلی لٹ کو پھٹی پرانی چادر کے نیچے دبا کر اِدھر اُدھر مجنونانہ انداز میں دیکھتی بڑھی چلی آ رہی تھی۔ پیرو کو دیکھتے ہی وہ رک گئی اور پھر بکریوں کو پیچھے چھوڑتی آگے بڑھی۔ پیرو کے مقابل آ کر یوں چپ چاپ کھڑی ہو گئی جیسے بہت کچھ کہنا چاہتی ہے، مگر زبان لوہے کا گولا بن کر رہ گئی ہے۔ ایک بار سفیدوں کی طرف دیکھ کر پلٹی اور ہانک لگائی۔ "اری او بکریو! ٹھہر جاؤ، مَیں اپنے بیٹے سے اجازت لے لوں تمہارے

چرنے کی۔"

پیرو کو بڑھیا کی دُکھوں سے لبریز آواز نے چونکا دیا۔ بولا ——— "اماں
سچ کہتا ہوں، مَیں کل شام سے بہت اداس ہوں اور نہیں جانتا کہ کیوں اداس
ہوں۔ صبح کو اٹھا تو چھت پر دیر تک بیٹھے رہنے سے گھبرا گیا۔ بکریوں کے دو
جانے میں بہت دیر تھی، اس لیے سفیدے ہانک کر یہاں آ گیا۔ میں نے
سورج نکلتے ہی، میرا بکریوں کو میرے پاس چھوڑ جائے گا۔ میں بہت شرمندہ ہوں
تم مجھ سے روٹھی تو نہیں اماں؟"

بڑھیا زار زار روتی، گھٹنوں پر ہتھیلیاں مارتی بیٹھ گئی۔ آنسو پونچھ کر
کچھ کہنا چاہتی تو آنکھوں سے ایک اَور دھارا اُمڈ آتی اور جب اسے چادر میں
جذب کر لیتی تو ایک اَور ندی بہہ نکلتی۔ بہت مشکل سے اس نے ایک مرتبہ کچھ
کہنے کی کوشش کی، مگر گھگھیا کر رہ گئی۔ آواز سسکی بن کر بے ہنگم انداز میں
بکھر گئی۔

پیرو چپ چاپ اس کے پاس بیٹھ گیا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اپنی حرکت
کے اِس حد سے زیادہ شدید ردِّعمل کی کوئی تاویل کہاں سے لائے۔ اور پھر
ساتھ ہی یہ خوف بھی تھا کہ کہیں کموں نے اس سے رات کی بات نہ کہہ ڈالی
ہو۔ اُنجان اور بھولی لڑکی ہے۔ ہو سکتا ہے، وہ محض اپنی کارگزاری جتانے کے
لیے بڑھیا کے سامنے رات کو بیداری اور پیرو کی خدمت گزاری کا قصہ لے
بیٹھی ہو، اور بات بات میں نہ کہنے والی بات بھی کہہ ڈالی ہو۔ بڑھیا کی مسلسل
اشکباری نے اس کے اس شک کو مضبوط کر دیا، اور مارے شرمندگی کے، وہ
ایک لفظ تک زبان پر نہ لا سکا۔ بڑھیا کو روتے دیکھتا رہا، اور خود بھیگی بلی بنا
بیٹھا رہا۔

بڑھیا نے گلا صاف کر کے اور ناک اور آنکھوں کو پونچھ کر بھاری
بھاری بیٹھی بیٹھی آواز میں کہا۔ "مجھے تو بیٹا سارا دکھ اِس بات کا ہے کہ تم نے

ہم غریبوں کو اچھی طرح نہیں سمجھا۔ خدا تمہاری عمر دراز کرے، تمہاری کمائی
میں برکت ہو، صحت کے ساتھ زندہ رہو اور پکے مسلمان کے پکے ایمان کے
ساتھ صدیوں بعد سدھارو۔ کتنی عجیب بات ہے کہ تم ابھی تک ہم کنگالوں کے
دلوں کو نہ ٹٹول سکے۔ تم نے یہ نہ دیکھا کہ ہماری بگھاری ہوئی دال کے پھسپھسے
پن میں ہماری طرف سے کتنے پیار گھُلے ہوتے ہیں۔ تم نے یہ نہ دیکھا کہ اپنے
غریب گھروندے کی جھکی ہوئی کالی بھجنگ چھت کو ہم نے تمہاری وجہ سے
چغتّوں کا شیش محل سمجھ رکھا ہے۔ تم اِتنا بھی نہ دیکھ سکے کہ میرا جب سارا دن
ڈھیریوں پر جنگلی ساگوں کی پتّیاں جمع کرتا پھرتا ہے، تو صرف تمہاری خاطر۔
کموں اگر ہر صبح اور ہر شام تھالوں کو آئینہ بنا کر رکھ دیتی ہے تو تمہارے
پیارے سفیدوں کے لیے۔ مَیں جو دن دن بھر صحن کی صفائی اور جھاڑ پونچھ میں
لگی رہتی ہوں، تو صرف اپنے پیرو بیٹے کی خاطر، جو خدا نے مجھے بن مانگے دیا،
جس کی نیکی کی ایک زمانہ قسم کھاتا ہے، جس نے غیروں کو اپنا بنایا۔ دیکھو بچے،
تم شاید میری اِن باتوں کا جواب دینا چاہتے ہو، تم زرد پڑتے جا رہے ہو۔ لیکن
جب سارا معاملہ صاف ہے، جب میں جانتی ہوں کہ تم کئی دن سے اداس ہو،
اور اداس صرف اس لیے ہو کہ تم ہم غریبوں سے تھک چکے ہو، جب مجھے
معلوم ہے کہ تم کموں سے پانی کا گلاس لینے میں بھی عار سمجھتے ہو اور اس کی ہر
بات کو رد کر دیتے ہو، جب مجھے اور تمہیں بھی پتہ ہے کہ تم آج صرف اپنے
بیلوں کو ساتھ لے آئے اور دھوبیوں کی بکریوں کو گھر پر ہی ممیانے کے لیے
چھوڑ آئے۔ جب میں یہ ساری باتیں جانتی ہوں تو تمہاری معافیوں کی کیا
ضرورت ہے؟ مَیں تو میرے بچے! ——— دیکھو، تم مجھے ٹوکنا نہیں، ورنہ مجھے
رونا آ جائے گا۔ مجھے میری بات ختم کر لینے دو۔ مَیں احسان نہیں جتا رہی۔ مَیں
نے تمہارے لیے کیا کیا دکھ بھوگے، یہ شاید تم نہیں جانتے۔ ہم کو دھوبی برادری
نفرت کی نظر سے دیکھتی ہے۔ میری کموں کو اس کی ہمجولیاں طعنے دیتی ہیں کہ

تمہاری ماں ایک مُسٹنڈا پال رہی ہے۔ میرے میرے کو لڑکے ٹھوکے مارتے ہیں کہ تم پیرو کے ٹکڑوں پر پلتے ہو۔ خود مجھے بڑی بوڑھیوں نے ایسا آڑے ہاتھوں لے رکھا ہے کہ جہاں جاتی ہوں' تمہاری ہی بات چھڑتی ہے۔لیکن میرے بچے' میں جانتی ہوں کہ چاند کا تھوکا ہوا منہ پر آتا ہے۔ مجھے ناز ہے کہ میں نے تم جیسے شریف نوجوان کی خدمت کی' اور اس بُری بھلی خدمت کا صلہ صرف یہ مانگا کہ تم کبھی اداس نہ رہو۔ ہم سے روٹھو نہیں' ہمیں ٹھکراؤ نہیں؛ اور اب تم یہ بدلہ دے رہے ہو ہمیں کہ —— دیکھو تمہاری بات بھی مَیں سن ہی لوں گی' پہلے مجھے جلے دل کے پھپھولے پھوڑ لینے دو؛ مجھے کہنے دو کہ میرا سینہ سلگ رہا ہے' ابھی مجھے بہت کچھ کہنا ہے۔ ابھی مجھے تمہیں کمتوں کی حالت بتانی ہے۔ وہ کس طرح پَو پھٹنے سے لے کر اب تک رو رو کر ہلکان ہو رہی ہے اور پائنتی پر سر پٹخ پٹخ دیتی ہے۔ کس طرح میرا ہم دونوں کو دیکھ دیکھ کر کڑھ رہا ہے اور بار بار تمہارے پاس جانے کو کہتا ہے۔ مجھے سب کچھ کہہ لینے دو' دیکھو بیٹا' بات یہ ہے کہ ——"

"بات یہ ہے اماں ——" پیرو بڑھیا کی تقریر کا سیلاب روکنے میں کامیاب ہو گیا —— "بات اصل میں یہ ہے اماں کہ تم نے بہت جلدی کی اور میرے بارے میں بہت غلط فیصلہ کیا۔ تم نہیں جانتیں کہ میں تمہارا خادم ہوں اور تمہارے احسانوں تلے میں ایسا دب چکا ہوں کہ اگر میں مردود اور بے ایمان بھی ہو جاؤں اور ان احسانوں کا بوجھ پرے پٹخنے کی کوشش بھی کروں تو بھی منہ کی کھاؤں گا۔ تم نے مجھے بے دام خرید لیا ہے اور تم ایک پل کے لیے بھی یہ نہ سوچو کہ تم سے میں روٹھ گیا ہوں' یا مجھے ان باتوں کا پتہ نہیں' جن کی طرف ابھی ابھی تم نے اشارے کیے ہیں۔ میں ایسا بھولا نہیں کہ ان باتوں کو نہ سمجھ سکوں۔ اصل میں —— اصل میں ——" اور یہیں پیرو تاویل کی تلاش میں کھو گیا۔

"ہاں تو کیا — اصل میں کیا بات ہے؟" بڑھیا بھڑک اٹھی۔

"اصل میں بات یہ ہے ماں۔" پیرو نے پپڑائے ہونٹوں پر خشک زبان پھیر کر کہا۔ "کہ مَیں اب تمہیں اِس گھروندے سے نکال کر ایک کھلے مکان میں بسانے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میں نے اس سلسلے میں جگہ جگہ زمین کی تلاش کی' مگر ذیلدار روڑا اٹکا رہا ہے۔ کہتا ہے' دھوبی زمین نہیں خرید سکتا۔ وہ چاہے تو اپنی ہی زمینوں پر مکان کھڑا کر لے۔ گاؤں کے کسی شخص نے پیرو دھوبی کے ہاتھ زمین بیچی نہیں اور پولیس کے ہاتھوں اس کی آؤ بھگت ہوئی نہیں۔ کل مجھے اس بات کا پتہ چلا کہ اس نے جنگل میں نیلے پتھروں کی چٹانوں پر پہرہ بٹھا دیا ہے تاکہ میں وہاں سے پتھر نہ اٹھا سکوں۔ یہی وجہ ہے میں اداس ہوں۔ تمہیں اس لیے نہیں بتایا کہ خواہ مخواہ گھبراؤ گی' اور میں چاہتا ہوں کہ دلاسے دھمکی سے یہ کام ختم ہو لے تو تمہیں اچانک ایک محل بنانے کی خوشخبری سناؤں ——!"

بڑھیا جیسے اپنی تمام گزشتہ اشکباریوں اور شکوہ سنجیوں پر ندامت محسوس کرنے لگی۔ اگرچہ آنکھیں بدستور ڈبڈبائی ہوئی تھیں اور جھرّیوں میں آنسو اٹکے ہوئے تھے' مگر اب اس کے سوکھے سڑے ہونٹوں پر ایک عجیب سی مسکراہٹ نمودار ہونا شروع ہوئی' جو پھیلتے پھیلتے اس کے سارے چہرے پر چھا گئی' اور پھر اس کا سارا جسم اس مسکراہٹ کی زد میں آ گیا۔ وہ کانپتی ہوئی اٹھی اور چٹاخ سے پیرو کے کندھے کو چوم کر بولی۔

"ہائے بیٹے مَیں بھی کیسی پگلی ہوں ——" اور ان چند سادہ الفاظ میں بڑھیا نے اپنی محبت کی ساری داستان کہہ ڈالی۔ ایک نئے انداز سے وہ پیرو کے قریب ہی بیری کے تنے کا سہارا لے کر بیٹھ گئی اور بولی "میرے بیٹے میں بھی کیسی پاگل ہوں' کتنی بری ہوں مَیں بھی کہ گھر بھر کو رلانے کے بعد تمہارے دل کو بھی ٹھیس پہنچائی۔ اصل میں بیٹا آج کل میں بہت اداس ہوں' شاید تم نہیں

جانتے کہ ایک جگہ میں کمّوں کی منگنی——"

مگر بڑھیا اچانک رک گئی' سامنے سے کمّوں اور میرا ہاتھوں میں پوٹلیاں لٹکائے آ رہے تھے۔ دونوں اداس تھے۔ دونوں کے ہونٹوں پر دکھوں کی پپڑیاں ثبت تھیں۔ قریب آ کر وہ رک گئے اور بڑھیا اور پیرو کو ٹکر ٹکر دیکھنے لگے۔ بڑھیا مسکرا رہی تھی' اور پیرو مسکرانے کی کوشش کر رہا تھا۔ کچھ دیر تک دونوں حیران کھڑے رہے ۔ آخر بڑھیا بولی۔ "بات تو کچھ بھی نہیں تھی کموں' خواہ مخواہ ہم نے رائی کا پہاڑ بنا لیا۔ ہمارا پیرو تو وہی پرانا سیدھا سادا پیارا پیارا پیرو ہے۔ ہم سب نے غلط سمجھا' اور ہم سب نے بہت برا کیا۔ معافی مانگو پیرو سے۔"

میرا کھلکھلا کر ہنس پڑا' اور کھانے کی پوٹلی پیرو کے آگے رکھ دی' مگر کمّوں کی حیرت جیسے دو چند ہو گئی۔ وہ دیر تک پیرو کو گھورتی رہی۔ بڑھیا کے بار بار کہنے پر مسکرانے کے لیے اپنی تمام قوتیں مجتمع کر لیں' مگر اس مسکراہٹ میں مسکراہٹ کم تھی اور روحانی کرب کی تھرتھری نمایاں تھی۔ اس کے ہونٹوں کے گہرے گوشے مستقل کپکپی بن کر رہ گئے' اس کی سرخ سیاہ آنکھوں میں ایک عجیب سا ویران' سنسان پھیلاؤ پیدا ہو گیا—— "اچھا تو بات کچھ بھی نہیں۔" اس نے جیسے اپنے آپ سے صلاح کی' اور پھر ایکدم بچوں کی طرح رو کر بولی ——"تو ہم سب بیوقوف ہیں ماں۔"

ان تینوں کے جانے کے بعد بڑھیا کی گفتگو کے آخری الفاظ پیرو کے دماغ میں گونج اور واویلے کا ایک غیر مختتم نغمہ الاپتے رہے۔ "کمّوں کی منگنی" کے الفاظ اُفق کے دور دراز دھندلکوں سے ایک نئے آہنگ' ایک نئے تال سُر سے جھنجھناتے ہوئے آتے' بار بار ان کے لہجے میں موڑ اور تناؤ پیدا ہوتے کبھی شہد کی مکھیوں کی طرح' اس کے دماغ کے ارد گرد پوری شدت سے بھنبھناتے' کبھی دور کی نیلی پہاڑیوں میں چھپ کر ایک سرگوشی بن کر ابھرتے

اور کبھی اس کی نسوں میں بس کر ایک دھماکے کی طرح اُبل پڑتے۔ شام تک وہ عجیب مذبذب عالم میں پڑا رہا۔ پوٹلیاں کھول کر کھانا اِدھر اُدھر بکھیر دیا۔ آنے والی شام کے خوف سے—— آشیانوں کو جاتے ہوئے کوّوں نے فضا سے اتر کر دعوت اڑائی' اور جب شام نے اپنے سرمئی فرغل کو پوری طرح کھول کر فضاؤں میں پھیلا دیا تو وہ سفیدوں کے پاس جا کر اس سوچ میں غرق ہو گیا کہ زندگی کے اس کُڈھب دوراہے پر پہنچ کر وہ کونسا راستہ اختیار کرے۔ اِدھر زخم آلود زندگی ہے' تو اُدھر بھوک اور پیاس کا تعفن ہے۔ اِدھر اجاڑ محبت کی خوفناک پیلی وسعتیں ہیں' تو اُدھر خالی پیٹ رہنے کی پھیکی تنگنائے۔ لیکن سفیدوں نے جلد ہی اسے اس جھولتے ہوئے ذہنی پُل پر سے اتار لیا اور وہ ان کے پیچھے یوں رینگنے لگا' جیسے طوفانوں کی شدّت سے ہار کر مانجھی ڈانڈیں ڈھیلی چھوڑ کر اپنے آپ کو ہوا کے رخ کے حوالے کر دیتے ہیں۔

گھر پہنچ کر اس نے بہت کوشش کی کہ اس کی مسکراہٹ مستقل طور پر اس کے ہونٹوں سے چمٹی رہے۔ وہ میرے کی ہر بات کا جواب دے اور کمّوں کی لائی ہوئی ہر چیز کھا لے' اور بڑھیا کے پاس جا کر دیر تک بیٹھ کر اس سے سارے محلے بلکہ سارے گاؤں کے گھریلو جھگڑوں کے حالات سنے' مگر کئی مرتبہ وہ ایکا ایکی سنجیدہ ہو گیا۔ ایک بار تو میرے کو گھرک بھی دیا۔ کموں' جس نے آج ترکاری کے علاوہ حلوہ بھی پکایا تھا' اور انڈے بھی ابال لائی تھی' مٹی کی ننھی ننھی رکابیوں میں کبھی اچار' کبھی سیاہ مرچ اور کبھی چٹنی لے آتی اور خاموش تقاضا کرتی کہ پیرو ہر رکابی اس کے ہاتھ سے لے کر اس کی طرف پُر معنی نظروں سے دیکھے' اور مسکرائے اور کچھ لانے کا حکم دے' مگر ایک مرتبہ تنگ آ کر پیرو نے کہا۔

"آخر پیٹ ہے' تنور نہیں ہے کہ ترکاری اور حلوہ اور انڈے اور اچار اور چٹنی' سب کچھ ٹھونستا چلا جاؤں۔ یہ انڈے لے جاؤ' میں نہیں کھاؤں

گا۔"

"کھانے پڑیں گے۔" کموں نے سختی سے کہا۔

"تو رکھ دے اُدھر۔"

"ہاتھ میں لینے پڑیں گے۔"

"نہیں لوں گا۔"

"تو مَیں سر پر رکھ دوں گی۔"

"رکھ دے۔"

اور کموں ننھی سی رکابی کو پیرو کے سر پر رکھ کر کھلکھلاتی ہنستی دوڑتی ہوئی دیوار کے پاس دھم سے جا گری۔ رمیرا مارے خوشی کے قلابازیاں کھانے لگا اور بڑھیا دعائیں دینے لگی۔

"اللہ میرے گھروندے میں قیامت تک اسی طرح قہقہے گونجتے رہیں' اللہ ہمارا پیرو ہم سے کبھی نہ روٹھے' اللہ میرے رمیرے کو نیک اور لائق بنا' اللہ میری کموں کا پردہ قائم رکھ۔"

جب پیرو نے کھانے سے فارغ ہو کر کموں کو برتن لے جانے کے لیے کہا اور کموں ایک چنگیر میں برتن ڈال چکی تو پیرو بولا۔

"انڈوں والی رکابی بھی رکھ لونا۔"

"کہاں ہے؟"

"میرے سر پر!"

اور قہقہوں کا ایک سیلاب اُمڈ پڑا۔ کموں مارے ہنسی کے بے حال ہو کر بولی —— "ماں ابھی تک انڈوں والی رکابی کو سر پر اٹھائے بیٹھے ہیں یہ۔ دیکھی ان کی ضد!"

اور یوں سارے گھر کے دلوں کو پھولوں کی طرح ہلکا پھلکا کر کے پیرو اپنی روح میں سارے جہان کے پربتوں کا بوجھ سنبھالے کھاٹ پر آ گرا۔ گاؤں

کی گونج ہولے ہولے مدھم پڑنے لگی اور پھر آہستہ آہستہ کتوں کی آوازوں میں بھی تھکن اور نیندیں بس گئیں' اور جب فضا سنسنانے لگی اور سفیدوں کی کھُرلیوں کے قریب ٹڈیوں نے الاپ چھیڑی تو پیرو نے تکیے پر سے سر اٹھا کر صحن میں جھانکا۔ اُدھر سے کموں کا سر بھی تکیئے پر سے اٹھا اور تب تک اٹھا رہا جب تک پیرو نے اپنا سر تکیئے پر نہ رکھ دیا۔ ایک طویل وقفے کے بعد پیرو نے پھر سر اٹھایا' تو اُدھر کموں نے بھی یہی حرکت کی اور پھر پیرو بستر پر اٹھ بیٹھا اور آواز دی۔

"رمیرے!"

اسے کوئی جواب نہ ملا۔ ٹڈیوں کی الاپ کٹ گئی۔

"اماں۔"

اب کے بھی صحن پر خاموشی طاری رہی۔

"کموں۔"

"جی۔" کموں جیسے اس بلاوے کی منتظر تھی۔

"تھوڑا سا پانی پلا دے۔"

"جی اچھا۔" اور وہ کنگن اور چوڑیاں سنبھالتی بہت احتیاط سے کھاٹ پر سے اتری' پنجوں کے بل گھڑونچی تک گئی' پیالہ اٹھائے چھت تک آئی اور نہایت دھیمی آواز میں بولی۔

"لیجیے۔"

"اوپر آ جاؤ۔" پیرو نے کہا۔

شاید اس دوسرے بلاوے کا بھی اسے انتظار تھا؛ پیالے کو منڈیر پر رکھتی اُچک کر چھت پر آ رہی' مگر چوڑیاں اور کنگن بج اٹھے' اور وہ منڈیر سے جیسے چمٹ کر رہ گئی۔

"ڈرتی کیوں ہو کموں؟" پیرو نے یوں پوچھا جیسے وہ کموں کی اس

ساری احتیاط کی وجہ سے بے خبر ہے۔

"کون ڈرتا ہے۔" کمّوں تن کر کھڑی ہو گئی اور پیرو کے قریب آ کر بولی۔ "مَیں ڈرنے والی نہیں، ڈرتے آپ ہیں جو کل سے اندر ہی اندر پُھنک رہے ہیں اور دل کی بات زبان پر نہیں لاتے۔ بتاؤں میں آپ کے دل میں کیا ہے؟" وہ چھت پر بیٹھ گئی۔

"میرے دل میں بَین ہیں، فریادیں ہیں، کراہیں ہیں۔" پیرو جیسے اپنے احساسات کا سارا اثاثہ کموں کے سامنے بکھیر ڈالے گا۔ "میرے دل میں جنگل ہیں، پربت ہیں، اندھی کھاڑیاں اور بلند چوٹیاں ہیں اور یہاں میری زندگی کا ہر پل سینہ کوٹ رہا ہے، یہاں خود میں اپنے ہی دانتوں سے اپنا ہی کلیجہ چبا رہا ہوں، اور تم——کمّوں——تم اِن جنگلوں اور پربتوں اور کھاڑیوں میں مست ہرنی کی سی قلانچیں بھرتی ہواؤں کے بازوؤں پر سوار بے پروائی سے اڑتی پھرتی ہو، اب تم ہی بتاؤ کہ میرے دل میں کیا ہے؟"

وہ ایک شہید کے سے یقین سے بولی۔ "آپ کے دل میں مَیں ہوں، اور میرے دل میں آپ ہیں مگر آپ اس لیے ابتک دل کی بات نہ کہہ سکے کہ آپ مرد ہیں اور میں اس لیے کہہ چکی ہوں کہ میں عورت ہوں اور جانتی ہوں کہ اگر میں اِس چوٹی پر سے سر کے بل گری، جہاں خیال ہی خیال میں پہنچ چکی ہوں، تو مجھے اپنے جینے مرنے کی تو خیر کیا فکر ہونی ہے، خوف یہ ہے کہ میرے دل کی امانت کو گزند نہ پہنچے۔"

پیرو نے اظہارِ محبت کے اِس فوری اور بے ہنگم جھٹکے سے گھبرا کر نہایت بے جوڑ بات کہہ دی۔

"مگر کمّوں تمہاری منگنی ہو چکی ہے۔"

"نہیں۔" کموں کے حلق سے یہ الفاظ ایک دھماکے کی طرح نکلا۔

"اماں کہہ رہی تھیں۔" پیرو بولا۔

اور کمّوں چپ چاپ، بُت کی طرح پیرو کو دیر تک دیکھتی رہی۔ پرلی طرف صحن میں میرا خواب میں کھلکھلا کر ہنسا، اور پھر کراہتا ہوا کروٹ بدل کر سو گیا۔ مگر کموں نے کوئی حرکت نہ کی۔ پیرو اس کے اس حیرتناک جمود سے بوکھلا سا گیا۔ کئی بار اسے بلانے کا ارادہ کیا، مگر کموں کے سکوت میں کچھ ایسا طنطنہ، کچھ ایسا جلال تھا کہ وہ خود بھی چپ چاپ بیٹھا ٹک ٹک کمّوں کے نیم اجلے پیکر کو گھورتا رہا، اور کمّوں اسے یا جانے کسے گھورتی رہی اور زندگی کی کڑوی کسیلی حقیقتیں ان کے دلوں میں رنگ رنگ کے زہریلے ماتمی غیر مرئی ناچ ناچتی رہیں۔ ان کے ذہنوں میں کتنے قرن بیت گئے۔ ماضی اپنے سارے اثاثے کی نمائش کرتا آیا اور غائب ہو گیا، اور حال کے تصادم سے ٹوٹا ہوا شعلہ دیر تک ان دونوں مبہوت پیکروں کے درمیان چڑیل کی طرح بے ڈھنگی قلابازیاں کھاتا ہوا فضا کو مسموم کرتا کھو گیا اور پھر مستقبل کے اندھیرے میں انہوں نے ٹامک ٹوئے مارے، لیکن اس راستے کے گہرے کھڈوں، ویران میدانوں اور سنسان جنگلوں میں وہ بھٹک بھٹک گئے۔ ارادوں نے یلغاریں کیں اور حقیقتوں کے خلاف مستقبل کے کہرے میں زبردست رَن پڑتے رہے، لیکن جنگ کے خاتمے کے بعد یہی ہوا کہ انہوں نے ارادوں کی لاشوں کو گھسیٹ کر ذہن کے سڑے بُسے قبرستان میں ٹھونسا اور اپنے چاروں طرف اٹل سچائیوں اور ازلی بے دست و پائیوں کی سنگین دیواریں اٹھا کر اپنے وجودوں ہی سے نکل بھاگے۔ ڈھانچے باقی رہ گئے اور روحیں انجانی راہوں پر ٹھوکریں کھاتی پھریں۔

کتنی دیر تک یہی عالم رہا۔ آسمان پر ستارے ٹوٹے، اور نقرئی کفن کو اپنے پیچھے اڑاتے تاریکیوں میں دفن ہو گئے۔ زہرہ کا جُھمکا دور پربت کی چوٹی تک لٹک آیا۔ فضا میں آنے والی صبح کی خنکیاں رچنے لگیں۔ مکانوں کے سرمئی ڈھیروں نے جیسے نیند سے چونک کر پَو پھٹے کی کچّی سپیدی کے استقبال کے لیے اپنی منڈیروں کو فضا میں اُبھار دیا۔ اچانک پیرو نے چونک کر کہا۔

"کمّوں، پُورب کا اندھیرا پھیکا پڑ رہا ہے۔ جاؤ سو جاؤ۔"

کمّوں چپ چاپ پیچھے ہٹی، چھت پر سے نہایت خاموشی سے اتری اور پھر پلٹتے ہوئے اچانک رک گئی۔ بڑھ کر منڈیر پر پڑا ہوا پانی کا گلاس اٹھایا، اور بانہہ بڑھا کر بولی۔

"اب تو شاید آپ کی پیاس بجھ چکی ہو گی۔"

"نہیں، مَیں پیوں گا۔" پیرو نے بڑھ کر پیالہ تھام لینا چاہا مگر کمّوں پیالے کو منڈیر ہی پر رکھ کر پلٹ گئی، پیرو نے پیالہ اٹھایا، اور بغیر اشتہا کے سارا پانی پی گیا۔ خالی پیالے کو بڑھا کر بولا۔

"یہ لو۔"

لیکن کمّوں اِس اثناء میں اپنی کھاٹ پر دراز ہو چکی تھی۔ خالی پیالہ کچھ دیر تک پیرو کے ہاتھ میں کانپتا رہا، اور وہ اٹھا تو دور افق پر منحنی سا زرد چاند آسمان سے چمٹا ہوا جیسے بچوں کی طرح رونے سے پہلے سسکیوں کا ذخیرہ جمع کر رہا تھا۔

"کمّوں۔" وہ جذبات کے انبوہ میں گھِر کر پکارا، اور جب اسے کوئی جواب نہ ملا، تو زیادہ بلند آواز میں کہا۔ "کمّوں ——— اے کمال خاتون۔"

اور کمّوں کے بجائے بڑھیا اٹھ بیٹھی۔

"کیا ہے بیٹا؟"

"پانی چاہیے امّاں۔" وہ گھبرا کر بولا۔

بڑھیا گودڑوں سے نکل کر گھڑونچی کے پاس گئی اور پیالہ ڈھونڈنے لگی ——— تنگ آ گئی تو بڑبڑانے لگی۔

"جانے کہاں دھر دیتے ہیں برتنوں کو۔ ٹھکانے پر نہیں رکھتے چیزیں۔ اِدھر سے اٹھائی اُدھر ڈال دی۔ چاہے بلّیاں کتّے چاٹتے پھریں ——— اے کمّوں اری او کمّوں، اری نیند کی ماتی! اُدھر میرا بیٹا پیاس سے بے حال ہو رہا ہے، اِدھر

پیالہ نہیں ملتا ——— کمّوں بیٹا ———"

لیکن کمّوں وہاں موجود نہ تھی، وہ زندگی کی بہت سی زنجیریں توڑ کر آنے والے دنوں کے گھپ اندھیرے میں بھٹکتی پھر رہی تھی اور بڑھیا کا واویلا محض بیکار تھا۔

آخر بڑھیا اندر گئی، اور ایلومونیم کا پیالہ لے آئی۔ دھویا، کھنگالا اور لبالب بھر کر پیرو کے پاس آئی۔ "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" اس نے پیالہ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ اور پیرو سارا پانی غٹاغٹ چڑھا گیا۔ بڑھیا بستر پر جا کر لیٹ گئی، تو پیرو کافی دیر کے بعد اٹھا۔ چپکے سے مٹی کا پیالہ گھڑونچی کے نیچے رکھ کر صحن سے باہر آیا، اور گاؤں سے نکلتا پُورب سے اُبلتے ہوئے اجالوں میں نہاتا دور لہراتی ہوئی پگڈنڈی کے آخری موڑ پر چٹانوں میں گھل گیا۔

اُسے اپنی بے دست و پائی کا یقین تھا، لیکن ساتھ ہی اس کا ضمیر بار بار اُس کی بے ہمّتی کا اعلان کرتا تھا۔ پگڈنڈی کے اتار پر وہ خیالوں میں اس قدر چُور تھا کہ اپنے وجود کو نہ روک سکا، اور لمبے لمبے تیز تیز ڈگ بھرنے لگا، اور پھر بھاگ اٹھا، اِس احساس کے بغیر کہ وہ بھاگ رہا ہے اور ڈھلوان پر سے اتر رہا ہے، اور جب اس کی رفتار بہت ہی تیز ہو گئی تو معاً اسے اس بے سبب دوڑ دھوپ پر ندامت محسوس ہونے لگی اور اس نے اپنے آپ کو روکنا چاہا، مگر توازن قائم نہ رکھ سکا اور لڑکھڑا کر بھیکڑ کی ایک جھاڑی میں جا گرا۔ سبز رنگ کے ٹڈے اِدھر اُدھر اڑ گئے اور قریب ہی بکائن پر بیٹھا ہُوا چڑیوں کا ایک غول بے شمار کنکروں کی طرح فضا میں بکھر گیا۔

اپنی اِس وحشیانہ حرکت پر اسے سخت غصّہ آیا اور وہ یہ تہیّہ کر کے اٹھا کہ اب وہ اپنے نظامِ زندگی کا کوئی نہ کوئی آخری فیصلہ کر ڈالے گا۔ اسے کمّوں سے محبت ہے، مگر اِس محبت میں سماج کے ساتھ ساتھ بڑھیا حائل ہے۔ کمّوں کو اس سے محبت ہے، مگر وہ نہیں جانتی کہ آئندہ زندگی کی یہ چمکتی دمکتی شاہراہ

اصل میں بے ہنگم کھڈوں اور بے تحاشا غاروں سے اَٹی پڑی ہے۔ اس لیے
محرومی ہی اس سارے ناٹک کا یقینی انجام ہے اور محرومی میں طرفین کو گلے
شکوے کا بھی کوئی حق نہیں پہنچتا۔ وہ محروم رہ کر اپنی زندگی کے سب سے
روشن اور لذیذ خواب پر پتھراؤ کر ڈالے گا' اور یہ اس کی بہت بڑی قربانی ہو
گی۔ لیکن پھر اس نے سوچا کہ آخر کموں کو اس ایثار کا کیسے علم ہو گا اور وہ ایثا
ہی کیا جو دلوں کے نہاں خانوں ہی میں تکمیل کی منزلیں طے کرے۔ انسان ایک
اَن دیکھے خدا کا پرستار ہونے کے باوجود اب تک غیر محسوس کی بجائے محسوس
قائل رہا ہے' اور جذبات و احساسات کی خود کشیاں ہزار کربناک سہی' مگر
مقابل کو تو کٹا ہوا گلا اور بھنچا ہوا کلیجہ چاہیے۔

وہ اِسی دُھن میں بہت دور تک نکل گیا۔ سورج سنہری طباق کی طرح
نیلے آسمان پر لرز رہا تھا اور زندگی پھریریاں لے رہی تھی۔ ہواؤں میں کروٹیں
تھیں' شبنم سے بھیگی ہوئی مٹی کی خوشبو میں انگڑائیاں تھیں۔ پنچ پتیے پھولوں
کٹوریوں میں اوس کے موتی چمک رہے تھے اور بھیکڑ کے سفید لمبوترے
پھولوں کی جڑوں سے شہد کی مکھیاں رس چوس رہی تھیں۔ کاندھوں کے ایک
مردانہ جھٹکے کے ساتھ اس نے پلٹ کر پگڈنڈی کو اس کی انتہا تک دیکھا' ا
ایک نئے ولولے' ایک نئے ارادے کی گلابیوں سے چہرے کو سجائے اس
گاؤں کی راہ لی۔ اپنے کھیتوں میں آکر اس نے ڈھلان کے بالائی حصے کا غور
معائنہ کیا۔ بوڑھی بیریوں اور ببکائنوں کے تنوں اور شاخوں کو دیکھا اور گنتا پھ
واپس گاؤں میں آکر ایک بوڑھے مستری کے ہاں جا دھمکا اور اس سے مش
کیا۔ "میں گاؤں میں رہ کر تکلیف اٹھاؤں گا' کھیتوں میں جاؤں گا تو مکان
دیکھ بھال کون کرے گا' اور پھر مجھے کھانا پہنچانے والا بھی تو کوئی نہیں۔"

"جورُو لانے میں کیا دیر لگتی ہے۔" بوڑھا مسخرہ مستری اپنی دھ
ننھی آنکھ کا ایک گوشہ دبا کر بولا۔ "چاند کے ساتھ ساتھ ستارا نہ ہو تو کیا

کھویا لگتا ہے بیچارہ۔ کہتے ہیں مَمولے سے مَمولن ایک دن کے لیے بھی بچھڑ
جائے تو خدا تمہارا بھلا کرے وہ باز کا شکار بننے کے لیے خود ہی اونچے پہاڑوں کی
طرف اڑ جاتا ہے۔ سو پیر محمد! تم اِس بَن میں جورُو بِنا کیسے گزر کر رہے ہو؟ دھر
نکالو کہیں سے۔ تمہارا تو رنگ روپ بھی خدا تمہارا بھلا کرے اچھا ہے اور پھر
زمینیں ہیں' اور وہ تمہارے سفیدے جن کی دھاک سارے علاقے میں بیٹھ چکی
ہے' خادم کو اجازت دو' تو خدا تمہارا بھلا کرے' کسی سیپی سے موتی نکال
لائے۔ کال بنگال میں ہو گا' یہاں غلہ بھی بہت ہے اور خدا تمہارا بھلا کرے
لڑکیاں تو موسلا دھار برس رہی ہیں اِس صدی میں' اور پھر اِدھر چلنے پھرنے کے
قابل ہوئیں اُدھر دوپٹہ سینے سے کھسکنے لگا۔ تو' خدا تمہارا بھلا کرے' میں کہہ رہا
تھا کہ جورُو لانے میں کیا دیر لگتی ہے۔"

"تو چچا" پیرو بوڑھے مستری کی تقریر پر کچھ خفا اور کچھ خوش ہو کر
بولا۔ "خدا تمہار بھلا کرے' مَیں کہہ رہا تھا کہ میں گاؤں میں مکان نہیں بنواؤں
گا۔ گاؤں سے باہر اپنی زمین ہے' درخت ہیں' پتھر ہیں' سب کچھ ہے۔ بس تم
بسم اللہ کر کے بنیاد رکھ دو اور چند روز میں مجھے ایک گھروندا کھڑا کر دو' جورُو ملی
تو گاؤں میں آ جاؤں گا۔"

"وہ تو آخر آنا ہی پڑے گا میاں۔" مستری نے پھر آنکھ کا ایک گوشہ
دبایا۔ "اِس زمانے کی لڑکیاں ڈھوکوں ویرانوں میں نہیں رہتیں۔ وہ زمانے' خدا
تمہارا بھلا کرے' گزر گئے' جب کسانوں نے گاؤں سے باہر ڈھوکیں بنائیں اور
بیویوں نے وہیں پڑے پڑے عمریں بتا دیں' پر گاؤں جانے کا نام نہ لیا۔ اب تو
خدا تمہارا بھلا کرے' بہت سے کام ہیں ان کے ذمے۔ پانی گھر میں پڑا ہو تب بھی
پنگھٹ پر ضرور جاؤ' اور کپڑے صاف بُرّاق ہوں' تب بھی تالاب کے کنارے
اَدھ ننگی بیٹھ کر گھٹنوں میں سینہ دے لو اور نئی نویلی دلہنوں کے نکھرے ہوئے
رنگ اور گھومتی ہوئی رانوں کی باتیں کرو۔ اور پھر خدا تمہارا بھلا کرے' عید

سے دس دن پہلے جھولا ڈالو' اور ٹوٹتی راتوں تک ——"

"تو پھر خدا تمہارا بھلا کرے چچا۔" پیرو نے تنگ آ کر کہا۔ "کیا مشورہ ہے تمہارا؟"

"شادی کر لو۔" بوڑھے نے برجستہ کہا۔

پیرو بے اختیار ہنسا۔

"مکان کے بارے میں؟" اس نے کہا۔

اور بوڑھا جھوٹ موٹ ہنستے ہوئے بولا۔

"مکان کے بارے میں؟ تو خدا تمہارا بھلا کرے' مکان کا کیا ہے؟ محل تو کھڑا کرنا نہیں کہ مہینوں لگ جائیں۔ خدا جتیا رکھے جورو کو' بیٹوں کی ایک فوج کی فوج موجود ہے۔ ہلّہ بول دیں گے۔ دو تین دن میں مکان تیار سمجھو' اور خدا تمہارا بھلا کرے' تم بیٹھتے کیوں نہیں کھاٹ پر۔"

بوڑھے مستری کو مکان کی تعمیر کا راز محفوظ رکھنے کی تاکید کر کے وہ گھر آیا تو بڑھیا کو بڑی غضب ناک حالت میں پایا۔ وہ چھوٹتے ہی بولی۔

"تم کہاں چلے گئے تھے بیٹا؟ میں تو پچھلے چند دنوں سے عجیب بیوقوف بن رہی ہوں۔ تم ہو سو اکتائے ہوئے ہو، کمّوں ہے سو ہر وقت آنکھیں بھیگی ہوئی ہیں' جیسے ماں مر چلی ہے اس کی۔ رمیرا ہے سو وہ کمّوں سے بڑھ کر ضدی ہے۔ میں نصیبوں جلی نہ جانے کیا کیا دکھ بھوگنے کے لیے زندہ ہوں۔ مرجاؤں تو سب کے جی ہلکے ہوں۔ خدا مجھ ایسی بدبختوں کو —— جوانی ہی میں موت دے دیتا —— تو کیا بگڑتا اس کا۔ یہ ڈھلتی عمر کے عذاب تو نہ سہنے پڑتے' اور پھر مانگے سے موت بھی تو نہیں ملتی۔"

"مگر بات کیا ہے اماں؟" پیرو نے پوچھا۔

"بات کیا ہونی ہے بیٹا۔" بڑھیا آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔ "تم شاید سویرے ہی کہیں نکل گئے تھے۔ میں نے کہا کوئی کام ہو گا۔ دیر ہوئی تو میں نے

کمّوں سے کہا کہ بیلوں' بکریوں کو کھیتوں میں لے جائے' پر وہ ناک چڑھا کر بولی۔ "میری طبیعت اچھی نہیں۔" آگ لگے ایسی طبیعت کو جو کبھی اچھی نہ رہے۔ جب دیکھو تیوری چڑھا رکھی ہے' جیسے مجھ سے قرضہ لینا ہے دادا کا۔ میں نے بار بار کہا کہ بیٹا' سفیدے رمیرے کے قابو میں نہیں آئیں گے۔ یہ تو گلیوں سے گزرتے ہیں تو دیواریں تک کانپ جاتی ہیں۔ تُو ہی اسے سنبھال کر لے چل' مگر اُدھر بس ایک "نہیں" ہی کی رٹ لگی رہی۔ تنگ آ کر میں نے رمیرے سے بیل لے جانے کو کہا تو غضب دیکھو بیٹا۔ مچل بیٹھی' کہنے لگی۔ رمیرا نہ جائے' میں جاؤں گی۔ پہلے کیوں نہ مانی! میں حیران بیٹا۔ اُدھر رمیرا ضد کر رہا تھا کہ میں جاؤں گا۔ ہوتے ہواتے آخر دونوں کو بھیج کر چین کی سانس لی ہے' پر تو کہاں چلا گیا تھا بیٹا؟"

پیرو ایک پیڑھی پر بیٹھ کر بولا۔

"آج مَیں بہت سی باتیں سوچتا رہا اماں۔ اور باہر اسی لیے گیا تھا کہ کمّوں اور رمیرا کھیتوں میں چلے جائیں' تو میں اکیلے میں اماں سے باتیں کر لوں۔ بڑا اچھا ہوا جو دونوں چلے گئے۔ تم بھی برا نہ مانا کرو اماں۔ اولاد ضد نہیں کرتی' لاڈ کرتی ہے اور ماؤں کو اس لاڈ پیار کا بوجھ عمر بھر اٹھانا پڑتا ہے۔ تو بات یہ ہے اماں کہ اُس روز تم نے کمّوں کی منگنی کا ذکر کیا تھا نا۔"

"ہاں ہاں" بڑھیا بولی۔ "مگر ذرا ہولے بیٹا' میں نے منگنی کی بات کسی کو نہیں بتائی۔ کمّوں کو بھی نہیں بتائی۔ گاؤں کے کسی دھوبی کو پتہ چل گیا تو سارا بنا بنایا کھیل بگاڑ کر رکھ دے گا' اس لیے بیٹا ذرا ہولے۔"

پیڑھی کو بڑھیا کے قریب کھینچ کر پیرو بولا۔

"منگنی کہاں ہوئی اور کب تک بیاہ کا ارادہ ہے اور اثاثہ کیا ہے تمہارے پاس؟ اور اثاثہ بڑھانے کے لیے تم نے اب تک کیا کیا؟"

بڑھیا رونے لگی۔

"اثاثے کی پوچھتے ہو تو اِس صندوق میں چاندی کے دو کنگن پڑے ہیں جو مجھے بیاہ میں ملے تھے' اور کپڑوں کے تین جوڑے جو میں سلائی پسائی کر کے بنا سکی۔ شریک لوگ تو بڑھ بڑھ کر باتیں بناتے ہیں' کسی کی زبان کون پکڑے! کہتے ہیں زمیندار کے سایہ تلے پل بڑھ رہی ہے کموں۔ کپڑوں اور زیوروں کی ایسی بھرمار کر رکھی ہو گی کہ ذیلدار بھی آنکھیں جھکا دے گا شرم کے مارے۔ اور کہتے ہیں کہ یوں دھوم دھام سے شادی ہو گی اور یوں ڈولی پر ولایتی ریشم کا تھان ڈالا جائے گا' اور یہ اور وہ۔ غرض جتنے منہ ان سے سوا باتیں۔ میری حیثیت کو تو تم جانتے ہی ہو۔ بکریوں کا دودھ بکتا ہے تو ایک وقت کا آٹا خریدتی ہوں۔ میری اور کموں کی سلائی پسائی سے کچھ رقم مل جاتی تھی' سو اب نگوڑی مشینیں آ پڑی ہیں۔ ہاتھ کے سِلے کپڑے اور چکی کے پِسے آٹے کو کون پوچھتا ہے؟ تمہارا غلّہ جو تم چند روز ہوئے خرید لائے تھے جوں کا توں رکھا ہے بوریوں میں۔ ایک دانہ بھی اپنے پر خرچ کیا ہو تو کافر ہو کر مروں۔ مرتے دم یا اللہ یا محمدؐ کہنا نصیب نہ ہو۔"

پیرو خفا ہو کر بولا۔

"تم اماں —— تم مجھے غیریت کے طعنے دیتی ہو' اور خود تمہارا یہ حال ہے کہ میں نے اپنے سارے اثاثے کو ساجھا کہہ رکھا ہے' اور تم میرا ایک دانہ بھی کام میں لانے کو عار سمجھتی ہو —— اور پھر تم کہتی ہو کہ میں تمہیں غیر سمجھتا ہوں۔ تم سب مجھے غیر سمجھتے ہو اماں' اور مجھے اِسی کا دکھ ہے۔ تم نے آج ——"

بڑھیا ہاتھ زمین پر مار کر کانوں کی لووں تک لے جا کر بولی ——

"میری زبان جل جائے جو میں نے تمہیں کبھی غیر کہا ہو' پر دیکھو نا بیٹا' بوڑھی ہوں۔ قبر کنارے کھڑی ہوں۔ وہاں حساب چکانا ہے۔ عمر بھر نیکی کا تو کوئی کام ہوا نہیں' کہیں ایسا نہ ہو کہ ——"

"مگر میں نے تمہیں اجازت جو دے رکھی ہے۔"

"ذرا ہو لے بیٹا' میں تو بات کر رہی تھی حیثیت کی۔ سو اب میں تمہارا غلہ بیچ کر کموں کے لیے کوئی گہنا بنوا لوں گی' اب تو خوش ہو؟"

"نہیں" پیرو نے کہا۔ "میں یہ غلہ نہیں بیچنے دوں گا۔"

"اچھا۔" بڑھیا کا رنگ فق ہو گیا۔

"یہ غلہ کموں کی شادی پر گاؤں بھر کا کھانا تیار کرنے کے کام آئے گا اور شادی کے گہنوں پاتوں کا انتظام بھی میں ہی کروں گا۔ میں ان نانہجار لوگوں کو دکھا دوں گا کہ وہ جس بات کو پھبتی سمجھتے ہیں وہ سچ بھی ہو سکتی ہے۔ کموں کی ڈولی پر ریشمی تھان ضرور ڈالا جائے گا۔ اس کے کپڑے دیکھ کر ذیلدار کا کلیجہ کٹ جائے گا۔ اس کے زیورات اندھیرے میں بھی چکا چوند مچا دیں گے۔ جب ڈولی اٹھے گی تو روپوں پیسوں کی بوچھاڑ میں' اور جب کموں ہمیشہ کے لیے اپنے گھر کی دہلیز الانگے گی تو اماں تم اپنے ہاتھ سے اپنی لاڈلی بیٹی کے ہاتھ میں ایک سو روپے کا کورا نوٹ تھماؤ گی۔ دنیا دیکھے گی اور سر گھٹنوں میں دے لے گی۔ علاقہ سنے گا' اور منہ میں انگلیاں ڈال لے گا۔ اور جب ہم مر جائیں گے تو آنے والی نسلیں کموں کے بیاہ کی باتیں کریں گی' اور یوں کموں کا بیاہ کہاوت بن کر قیامت تک زندہ رہے گا۔"

پیرو آخری لفظ کہہ چکنے کے بعد اچانک مبہوت ہو کر رہ گیا۔ وہ اپنی پوری پوری قوت سے چنگھاڑ چنگھاڑ کر باتیں کر رہا تھا اور بڑھیا کو مارے خوشی کے لرزہ چھوٹ گیا تھا۔ اس کے ہونٹوں میں مسکراہٹیں ناچ رہی تھیں۔ آنکھوں سے آنسوؤں کے چشمے ابل پڑے تھے۔ سونی کلائیوں کی رگیں ابھر آئی تھیں۔ وہ بار بار ہاتھوں کو مل کر میل کی مروڑیاں گراتی اور کہتی۔

"ایسا ہی ہو گا —— اللہ کرے ایسا ہی ہو۔ دنیا دیکھے اور دھک سے رہ جائے۔ دھوبی دیکھیں اور عمر بھر جلتے رہیں' میرے بچے' میرے لال۔"

مگر پیرو بڑھیا کی باتیں سننے کے بجائے ایک اَور سوچ میں غرق ہو چکا تھا۔ دروازے پر کمّوں کھڑی تھی۔ ایک ٹوٹے ہوئے ستارے کی طرح اداس اور ایک باسی پھول کی طرح کھوئی کھوئی۔ اس کے ہونٹوں پر کپکپی تھی اور آنکھوں میں غبار تھے۔ اس کے کھلے بالوں کا ایک گچھا سا بار بار اس کے ماتھے پر تڑپ کر اوپر اٹھ جاتا تھا۔ اس کے گالوں میں زردی اور سرخی کا ایک عجیب سا امتزاج نمایاں ہو رہا تھا۔

"کمّوں۔" بڑھیا چونک کر چیخی۔ "آجاؤ بیٹا۔"

اور کمّوں جیسے اشارے کی منتظر تھی، بے اختیار رونے لگی، اور پھر بجلی کی سی تیزی سے بھاگ کر اندر کھاٹ پر اوندھے منہ جا گری۔ بڑھیا لپک کر اسے دلاسا دینے لگی، اور پیرو ان سے اوجھل ہو کر دیوار سے لگ کر بیٹھ گیا۔ اندر سے رونے سسکنے کی آوازیں برابر آتی رہیں۔ بڑھیا نے اسے چمکارا پچکارا۔ اپنے مرجانے کی دھمکیاں دیں اور ایک مرتبہ کہہ ڈالا —— "پیرو بیٹا ہم سب سے روٹھ کر چلا جائے گا۔"

"چلا جائے۔" بھرّائی ہوئی مگر طعنوں اور شکووں سے لبریز آواز میں وہ گرجی اور پھر ایک جذبے سے پلٹ کر اٹھ بیٹھی۔ بھیگے ہوئے چہرے پر بالوں کی لٹیں چمٹ گئی تھیں۔ چولے کا ایک بٹن ڈھیلا ہو کر لٹک رہا تھا، اور سر کی چادر کھاٹ کے پائے سے لپٹ گئی تھی۔

"چلا جائے جہاں جی چاہے۔ مجھے کیوں ڈراتی ہو پیرو کے غصے سے؛ میں جانتی ہوں اسے، وہ بزدل ہے۔"

"چپ ہو کُتّی۔" بڑھیا غرّائی۔

مگر کمّوں کی تو جیسے آنکھیں ابل پڑی تھیں —— "وہ بزدل ہے، میں ایک بار نہیں ہزار بار کہوں گی وہ بزدل ہے، بزدل ہے، بزدل ہے۔"

زنّاٹے سے ایک طمانچہ کمّوں کے گال پر پڑا، اور باہر پیرو بھڑک کر

اٹھ بیٹھا اور اندر جا کر بڑھیا کو باہر گھسیٹ لایا۔

"مَیں بزدل ہوں۔" اس نے التجا آمیز نظروں سے بڑھیا کو دیکھتے ہوئے کہا۔ "سچ مچ اماں، مَیں بزدل ہوں —— کمّوں ٹھیک کہتی ہے۔ اس نے یہی سمجھا ہے، اور خدا کا شکر ہے کہ وہ اس سے زیادہ نہیں سمجھتی۔"

مگر بڑھیا پر تو وحشت سوار ہو چکی تھی۔ کمّوں کو ایسی ایسی گالیاں دیں کہ پیرو نے بڑے بڑے سرفروش بدمعاشوں سے بھی نہیں سنی تھیں، اور کمّوں اندر کھاٹ پر اسی آشفتہ حالت میں مبہوت بیٹھی خلا میں گھور رہی تھی۔ باہر دروازے پر چند پڑوسنیں ناکوں اور ٹھوڑیوں پر انگلیاں رکھے معاملہ کی تہ میں جانے کی کوشش میں کان لگائے کھڑی تھیں۔ مگر پیرو نے لپک کر دروازہ بند کیا اور زنجیر چڑھا دی۔ مڑ کر دیکھا تو بڑھیا لاش کی طرح دہلیز پر پڑی تھی اور اندر کمّوں نے اگرچہ چادر سر پر ڈال لی تھی مگر اس کا منہ اسی طرح کھلا تھا اور آنکھیں اسی طرح لبریز۔

عصر کے وقت جب سائے پھیل کر بے کنار ہو گئے اور ہواؤں میں خنکیاں بس گئیں تو کمّوں دو گاگریں سر پر رکھے پنگھٹ پر چلی گئی۔ میرا بُھنے ہوئے چنے لے کر سفیدوں کو واپس لانے چلا گیا۔ تنہائی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے پیرو بڑھیا کے پاس گیا اور بولا۔

"کمّوں بھی عجیب لڑکی ہے۔"

"اس کا یہ رنگ تو آج ہی دیکھا ہے میں نے۔" بڑھیا بولی۔ "یہ تو بڑی سلیقے والی بڑی فرمانبردار تھی۔ جانے کیا آفت ٹوٹی اس پر کہ میں تو خیر پہلے دن کی نگوڑی ماری ہوں، تمہارے پیچھے پڑ گئی اور تمہیں ایسے برے بول سنا دیئے۔ آخر کیوں کہے یہ لفظ اس نے! کیسے اندازہ لگایا اس نے۔ میں تو ابھی تک ہونٹ چبا رہی ہوں۔ اللہ کرے میں مرجاؤں یا یہی کلموہی آنکھوں سے اوجھل ہو جائے۔ چھلپائی، کُتّی، بدذات۔"

پیرو نے بڑھیا کو سمجھایا بجھایا' مشورہ دیا کہ کموں کے بیاہ کی جلد تیاری کرے۔ کیونکہ پڑوسنوں نے آج کے واویلا سے اندازہ لگا لیا ہو گا ساری بات کا اور کیا عجب ہے کہ وہ کوئی نئی کہانی گھڑ لیں۔ ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ بڑھیا لڑکے والوں سے ایک ہفتہ کے اندر اندر کوئی دن مقرر کر لے۔ اِسی دوران میں وہ بہت سی رقم جمع کر لائے گا۔

"کہاں سے؟" بڑھیا نے پوچھا۔

"سفیدے بیچ ڈالوں گا۔" پیرو نے یوں کہا' جیسے اس کے نزدیک سفیدے محض مٹی کے کھلونے ہیں۔

بڑھیا کے منہ سے الفاظ ایک فوّارے کی طرح نکل کر بکھر گئے۔

"سفیدے بیچ ڈالو گے؟ کہیں دماغ تو نہیں پھر گیا میرے بیٹے کا؟"

"نہیں —— دماغ ہم سب کے درست ہیں' اور سفیدوں کو بیچنا ہی ہو گا۔"

"کیوں؟"

"میری مرضی یہی ہے۔"

"آخر کیوں؟"

"میں یہی چاہتا ہوں۔"

"میں یہ نہیں ہونے دوں گی۔"

"کیوں؟"

"مَیں یہ کبھی نہیں ہونے دوں گی۔ میں کموں کو کھدر میں لپیٹ کر مالکوں کے حوالے کر دوں گی۔ میں اپنے گھر میں مہندی کی کڑاہی نہیں گھولوں گی۔ میں میراسئیں نہیں بلواؤں گی' زیور نہیں دکھاؤں گی۔ چپ چاپ' گُڑ کی بھیلی کی طرح اس امانت کو اس کے ہاتھ پر رکھ دوں گی' پر سفیدے یہیں رہیں گے۔ اسی چھپر تلے' یہیں' اسی صحن میں؛ یہ سفیدے جن کی ٹکر کا بیل سارے

ضلع میں نہیں۔ جن کو خریدنے کے لیے تمہارے پاس دور دور کے جاگیردار آئے تھے۔ جن کے کھُروں کی ٹھوکر سے پتھر تک چیخ جاتے ہیں۔ یہ سفیدے جن کے دم سے تمہارا سر اونچا ہے' تمہارا نام بڑا ہے' تمہاری عزت قائم ہے۔ نہیں میرے بیٹے' یہ نہیں ہو گا۔ قسم کھاؤ کہ ایسا نہیں ہو گا۔"

"مَیں قسم کھاتا ہوں کہ ایسا ہی ہو گا۔ سفیدوں کے سے ہزاروں بیل مل سکتے ہیں مگر غیرت کہیں بکاؤ نہیں؛ اور پھر تمہاری عزت میری عزت ہے۔ یہ غریب دھوبن کی لڑکی کا بیاہ نہیں' ایک مغرور اور غیرت مند زمیندار نوجوان کی عزت و آبرو کا امتحان ہے' اور مَیں اپنی آبرو کو اپنے سفیدوں سے' اپنی زندگی سے قیمتی سمجھتا ہوں۔"

بڑی ردّوکد کے بعد بڑھیا نے لڑکے والوں سے اگلے جمعے کی تاریخ مقرر کرنے کا وعدہ کیا اور جب میراسفیدوں کو واپس لے آیا تو بڑھیا کو تھرتھری سی چھُوٹ گئی۔ پیرو کو کھانا دینے آئی تو سرگوشی میں کہا۔

"بیٹا یہ سفیدے' یہ دودھ مکھن کے پلے' خدا کے لیے' رسول کے لیے' پیر دستگیر کے لیے۔"

مگر پیرو تہیّہ کر چکا تھا۔ بڑھیا کو اپنے ارادے کی پختگی کا احساس دلایا اور سمجھایا کہ علاقے میں نئے نئے ڈاکوؤں کا ہنگامہ بپا ہے اور پولیس ان کے پیچھے ماری ماری پھر رہی ہے اس لیے وہ قصبے میں جا کر شادی سے صرف ایک دن پہلے بیل بیچ کر بنے بنائے کپڑے اور گھڑے گھڑائے زیور خرید لائے گا۔ ابتدائی خرچ کے لیے وہ ایک دکاندار سے چند روپے بھی مانگ لایا۔

اُسی دن شام کو ذیلدار نے ڈھنڈورا پٹوایا کہ پولیس کے خیال میں ڈاکو ہمارے گاؤں میں رات بسر کرنے آتے ہیں اس لیے تھانیدار صاحب نے گاؤں والوں پر یہ جرمانہ لگایا ہے کہ وہ ہل چلانا چھوڑ دیں۔ جو شخص ہل چلاتا ہوا پکڑا جائے گا' اسے بغیر کسی مقدمہ کے حوالات میں ٹھونس دیا جائے گا۔ جب

تک گاؤں والے ڈاکوؤں کو پولیس کے حوالے نہیں کریں گے' یہ پابندی جاری رہے گی' چاہے سال گزر جائے۔ اور "پھر ملک خدا کا' حکم حاکم کا' گاؤں والے خبردار رہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" ہر طرف سے واویلا بلند ہوا۔ "ملک خدا ہی کا ہے اور حکم بھی ایک صدی سے حاکم ہی کا ہے' مگر ہل کے یہی تو دن ہیں' جو لوگ پچھلے ایک ہفتے میں نلائی نہ کر سکے' وہ کیا کریں گے آخر۔" ذیلدار کی چوپال پر آن کی آن میں سارا گاؤں جمع ہو گیا۔

"یہ عجیب جرمانہ ہے جی کہ ہم جھوٹے سچے شک کے بدلے سال بھر کی کمائی سے ہاتھ دھو بیٹھیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے جی؟"

"میں کیا کروں؟" ذیلدار مونچھ کی نوک کو نتھنے کے بالائی ابھار پر پھیرتے ہوئے بولا۔ "تھانیدار صاحب اندر بیٹھے ہیں۔ انہیں کا حکم ہے۔ ہمارا کیا بس چل سکتا ہے حاکموں کے سامنے۔"

"آپ گاؤں کے سردار ہیں۔" مجمع کے مرکز سے پیرو کی گرجدار آواز آئی۔ "آپ تھانیدار کو صلاح دے سکتے ہیں - وہ ہم پر جرمانہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں تو جنس لیں۔ روپیہ لیں۔ ہم مانگ تانگ کر ان کا حکم پورا کر دیں گے۔ پر یہ سال بھر کی تباہی' آخر کیوں؟ یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ ہل ضرور چلے گا۔ ہل کو کوئی نہیں روک سکتا۔ ہم حاکم کے نوکر سہی' پر ہمارا ہل کسی کا غلام نہیں' یہ قیامت تک چلتا رہے گا۔ بتا دیجئے تھانیدار کو۔"

"ہاں ہاں" لوگ چلّائے۔ "کہہ دیجئے حاکم مہاراج کو۔ ہمارا ہل ہمارے بس میں نہیں۔ اسے زمین کا سینہ چیرنے کی لت پڑ چکی ہے۔ یہ صحنوں کے کونوں میں پڑا نہیں رہ سکتا۔"

تھانیدار نے اندر گالیوں کا طومار باندھ دیا۔ اور پھر باہر آ کر اس نے گاؤں والوں کو وہ بے بھاؤ کی سنائیں کہ سب کے حوصلوں پر اوس سی پڑ گئی۔

کونے میں بیٹھے ہوئے سپاہیوں نے اٹھ کر ہتھکڑیاں چھنچھنائیں' بندوقیں چمکیں' اور چوپال کی پرلی طرف ذیلدار کے گھر میں ذبح ہوتے ہوئے مرغوں کے واویلا میں تھانیدار گرجا۔

"یہ پنچایت کا حکم نہیں کہ ٹال جاؤ گے۔ یہ سرکار کا حکم ہے۔ ڈاکو لے آؤ اور ہل چلاؤ۔ ڈاکو نہیں لاؤ گے تو ہل نہیں چلنے دوں گا۔ کسی نے جرأت کی تو میں اس کی——"

"گالی دینا شرافت نہیں صاحب۔" پیرو گرجا۔ "ہم سرکار کا دیا زہر کھا لیں گے' گالی نہیں کھائیں گے۔"

"تُو کون ہے بے رانی خان کا سالا۔" تھانیدار تڑپ کر ریچھ کی طرح پنجوں کے بل کھڑا ہو گیا۔ ذیلدار نے غضب ناک ہو کر پیرو کو گھورا۔ سپاہی بے قرار ہو گئے اور دیہاتیوں کا انبوہ اپنے بپھرے ہوئے نمائندے پیرو کو اپنے ریلے میں بہاتا بکھر گیا۔

ہل رک جانے سے سارا دن گاؤں میں ہنگامہ سا مچا رہتا۔ چوپالوں پر' چوراہوں پر' گلی کے نکڑوں پر' موچی کی دکان میں' مسجد کی بکائن تلے' ہر جگہ دیہاتیوں کی ٹولیاں بھٹکی ہوئی کونجوں کی طرح اداس اداس پھرا کرتیں' مگر پیرو دن بھر بوڑھے مستری کے ہمراہ اپنے کھیتوں کی ڈھلان پر گزار دیتا۔ اس کا ننھا گھروندا آہستہ آہستہ ابھر رہا تھا۔ وہ گارے اور پتھروں کے اس لحہ بہ لحہ پھیلتے ہوئے ڈھیر کو چپ چاپ دیکھا کرتا۔ بوڑھا مستری اپنی عادت سے مجبور ہو کر اپنے لڑکوں کو ڈانٹ پلاتا۔

"ہت تمہاری نانی مرجائے حلوے کی کڑاہی میں گر کر۔ گارا لیپو نہیں' خدا تمہارا بھلا کرے' تھوپو۔ گول پتھر پرے پھینکتے جاؤ۔ ایک کھسکا تو ساری دیوار نیچے آ رہے گی سلامو موچی کی آنکھ کی طرح۔ ارے او نبوّ! پگڈنڈی کو کیوں گھورے جا رہا ہے' خدا تمہارا بھلا کرے' کمبخت وہ بیری کے پاس لڑکی

نہیں کھڑی' بکری پتے کھا رہی ہے۔ بھیّا پیر محمدؐ —— مجھے تو ان چھوکروں ن
تنگ کر رکھا ہے۔ یعنی یہ بھی کوئی دستور ہے کہ کھانا بھی کھلاؤ اور بیویاں بھ
ڈھونڈتے پھرو۔ ارے نامردو' نکل جاؤ کہیں' مارو آنکھ' اور بھوگو قسمت ا
لکھا۔ آنکھ نشانے پر بیٹھی تو خدا بھلا کرے' پانچوں گھی میں اور سر بھی اللہ ر
گھی میں' اور نشانہ چوک گیا' تو سہو بے بھاؤ کی' اور دعائیں دو اپنے آپ ک
کیوں پیر محمدؐ۔"

"ٹھیک ہے۔" پیرو کہتا۔

"واہ! —— خاک ٹھیک ہے۔" بوڑھے مستری کے دلائل کا سلسلہ رکتا ہی نہ تھا۔ "تم کیا جانو ان باتوں کو۔ ہم سے پوچھو۔ جوانی کی بات ہے۔ ایک بار خدا تمہارا بھلا کرے۔ ایک لڑکی نے ہمیں دیکھ کر ناک اوپر اچھال دی۔ ہم نے کہا' اچھا' تو یہ نخرے ہیں تیرے۔ سچ کہتا ہوں بیٹا' دنوں میں ہتھوڑے کی طرح پڑا' اور خدا تمہارا بھلا کرے' ڈھیر کر کے ڈال دیا' اور ت
کمبختو! —— اے' ابے گاریاں لگاتے ہیں' دُھت۔ تم تو لقمہ بھی منہ ک
بجائے کان میں ڈال دیتے ہو گے گھن چکر ——"

پیرو بوڑھے مستری کی تقریر سے تھکتا تو ڈھلانوں سے نیچے اتر آتا۔ جب سفیدے اس کی طرف دیکھنے کے لیے سر اٹھاتے' اپنے کانوں کی محرابیں
کر دُم ہلاتے' اور ناک کے رستے زور زور کی سانسیں نکال کر لال آنکھیں جھپکاتے تو پیرو بے دم ہو کر بیٹھ جاتا۔ پھر اٹھ کر دور چلا جاتا۔ وہاں سے سفیدوں کو دیر تک دیکھتا رہتا۔ پلٹ کر ان کے پاس آ جاتا۔ ان کے جسموں
ہاتھ پھیرتا۔ اپنے پوٹوں پر انگلیاں پھیر کر ان کے سینگوں کو چپڑتا۔ ان کے کُھرو
میں اٹکے ہوئے تنکے نکالتا' اور پھر ان سے باتیں کرتا۔

"تم نئے مالک کے گھر میں جا کر مجھے بھولو گے تو نہیں؟ میرے بچو!
یہ تو نہیں کہو گے کہ میں نے تم سے بے وفائی کی؟ تم مجھ سے یہ گلہ تو نہیں کر

گے کہ میں نے خود غرضی سے تمہیں بیچ ڈالا؟ تم نہیں جانتے میرے دوستو کہ میرے دل کے ویرانوں میں کیسے کیسے الاؤ بھڑک رہے ہیں۔ تم کموں کو جانتے ہو نا؟ وہ جو تمہیں چارا ڈالنے میں ہمیشہ پہل کرتی رہی ہے' جس نے تمہارے تھانوں کو آئینہ اور تمہاری کُھرلیوں کو مصفّا رکھا ہے۔ چند در چند مجبوریوں کی وجہ سے میں اس کموں کا نہیں ہو سکا۔ مگر اب سوچتا ہوں کہ میں نہیں تو کم از کم میری دولت' میرا سرمایہ' میرا اثاثہ تو اس کا ہو جائے۔ اِس طرح مجھے تسلی ہو گی۔ مجھے سُکھ ملے گا۔ میری دولت' میرا سرمایہ تمہیں تو ہو۔ تم اپنے مالک کے سکھ کے لیے محبت کی قربان گاہ پر لائے جاؤ گے' تم روٹھو گے تو نہیں مجھ سے؟
——"

بیل جیسے پیرو کی سب باتیں سمجھ کر کہتے۔

"تم بزدل ہو' تم کمّوں کی ماں سے زیادہ سماج سے ڈرتے ہو' مذہب سے ڈرتے ہو' اپنے ضمیر سے ڈرتے ہو' تم بزدل ہو' تم پرلے درجے کے بزدل ہو۔"

پیرو ذہن میں اٹھتی ہوئی ان پکاروں کو روکنے کے لیے جنگلی پھول توڑنے لگتا' بیریوں کے تنوں کو جھٹکاتا۔ بھیکڑوں کے پتے توڑ کر ان کی "ٹُریاں" بنا کر بجاتا' پتھروں سے پرندوں کو نشانہ بناتا' مگر جب بیلوں کی لال آنکھوں اور لہراتی دُموں کو دیکھتا' تو اس کے ضمیر کی ملامتیں دگنی شدت سے بلند ہوتیں۔ وہ دیوانوں کی طرح کنکروں پر لیٹ کر کروٹیں بدلتا اور بڑے بڑے پتھروں کے ننھے ننھے گڑھوں میں اُگی ہوئی معصوم بُوٹیوں کو توڑ کر ہتھیلیوں میں مسل ڈالتا۔ ادھر بوڑھا مستری ہانک لگاتا۔

"اے پیر محمد' بھئی خدا تمہارا بھلا کرے' یہ مہندی کے دن نہیں۔"

اور پیرو کھسیانی ہنسی ہنس کر گھروندے کے قریب آ جاتا۔

اُدھر بڑھیا نے شادی کی تیاریاں شروع کر رکھی تھیں۔ کمّوں کو بھی

شاید اِن سب پسِ پردہ مصروفیتوں کا احساس تھا' کیونکہ وہ ہر وقت گھبرائی گھبرائی' شرمائی شرمائی رہنے لگی تھی۔ میرے کے کان میں کہیں سے اِس ہونے والے حادثہ کی بھنک پڑ گئی تھی اور وہ کموں کا بہت زیادہ فرمانبردار ہو چلا تھا اور جب شادی میں صرف ایک دن باقی رہ گیا' اور کموں کو مایوں بٹھا دیا گیا' تو اس شام کو پیرو نے قصبے میں جانے کی تیاری کی۔ صحن لڑکیوں سے بھرا ہوا تھا۔ پیرو کی بے وقت تیاری سے سب لڑکیاں مشوّش سی نظر آنے لگیں۔ بڑھیا پر سوالات کی بوچھاڑ ہو گئی۔

"آخر اس وقت کہاں چلے ہیں پیرو بھیّا۔"

"کوئی ضروری کام ہے۔" بڑھیا نے سب کو ٹالنا چاہا۔

"ایسا کیا ضروری کام ہے۔" میرا بولا۔ " پرسوں کیوں نہیں چلے جاتے؟"

"تو نہیں جانتا۔" بڑھیا نے آنکھیں دکھائیں۔

مگر جب پیرو نے سفیدوں کو کھونٹوں سے کھولا تو بڑھیا ماحول کا انداز لگائے بغیر بچوں کی طرح چلّا اٹھی۔ ایک مرتبہ اپنے سینے پر دوہتڑ بھی مار لیے۔ چھپر کی طرف بھاگی مگر رک کر پلٹی اور پھر آنسو اور فریادیں روکنے کی ناکام کوشش کرتی' سمٹی سکڑی ہوئی کموں کے پاس آن گری۔ وہ بھی جیسے پہلے سے بھری بیٹھی تھی۔ رکا ہوا دھارا بند توڑ کر لپکا اور ڈھولک پر تیل ملتی ہوئی میراں مبہوت ہو کر تھالی گھڑا بجانے والی لڑکیوں پر جھپٹی۔

"ارے چپ' یہ تو ماں بیٹی رونے لگیں' جانے کیا——"

شام کے بڑھتے ہوئے اندھیرے میں گیت رک گئے۔

تھالی اور گھڑے کا دلآویز تال کٹ کر رہ گیا۔ لڑکیاں دم بخود کھڑی ماں بیٹی کی چمکتی ہوئی آنکھوں کو دیکھ رہی تھیں۔ ممیاتی ہوئی بے قرار بکریوں کو دیکھ رہی تھیں۔ چھپّر کے نیچے گندے بھوسے اور گوبر میں لیٹتے اور بلکتے ہوئے میرے

کو دیکھ رہی تھیں' اور اندھیرا بڑھ رہا تھا۔ لالٹین کے اُجلے شیشے کے ارد گرد پتنگے جمع ہونے لگے تھے۔ نمازی مسجد سے واپس آ رہے تھے اور مہندی لگانے کے شوق میں ننھی لڑکیاں چھتوں پر چھپ چھپ کر کھسکتی چلی آ رہی تھیں۔

ایک طویل وقفے کے بعد بڑھیا اٹھی اور چھپّر کے نیچے جا کر روتے چلّاتے میرے کو خاموش کرانے لگی۔

"اب آ جائے گا پیرو بیٹا۔"

"پر گیا کیوں؟" وہ بھوسے سے بھرے ہوئے بالوں کو جھٹکا کر رونی آواز میں بولا۔ "کہاں گیا' ہل کیوں لے گیا اپنے ساتھ؟"

"ہل بھی لے گیا؟"

"ہاں —— اُدھر کونے سے ہل اٹھایا تو میں نے پوچھا۔ بھیا ہل کہاں لے چلے؟ کہنے لگا چپ' کسی کو بتانا نہیں۔"

"ہل بھی لے گیا!" بڑھیا ششدر رہ گئی۔ "آخر ہل کیوں لے گیا؟"

"پیرو ہل کیوں لے گیا اپنے ساتھ۔" اس نے کموں کے پاس آ کر ساری لڑکیوں سے پوچھا۔ مگر سب حیرت سے آنکھیں جھپکانے لگیں اور کموں ہولے سے بولی۔

"ہل بھی لے گئے؟"

"ہاں —— ہل بھی لے گیا۔"

"کیوں لے گئے؟"

"جانے کیوں لے گیا؟"

"یہ کیا بات ہوئی؟"

"جانے۔"

اور مکمل سکوت نے ایک مرتبہ پھر سارے صحن کو گھیر لیا۔

ہل ساتھ لے جانے کی وجہ بڑھیا کی سمجھ میں تو نہ آئی' مگر پیرو کی اس

حرکت کے پیچھے اس کی زندگی کی تمام بہاروں کی امنگیں کارفرما تھیں۔ سفیدوں
سے اسے محبت تھی۔ اُسے اِن زمینوں سے محبت تھی جن پر محنت کر کے اس
نے اپنا مرتبہ خاصا بلند کر لیا تھا۔ ان ڈھلانوں سے محبت تھی جہاں اس نے اپنے
احساسات کی کونپلیں پھوٹتی دیکھیں۔ اور پھر ان کونپلوں میں پھول آئے، وہیں
گرے اور وہیں مرجھا گئے۔ اسے اس ادھورے گھروندے سے محبت تھی، جس
میں اس کا موہوم مستقبل اس کی راہ تک رہا تھا اور پھر ماحول کی تمام جزئیات پر
اُڑ کر اس کا ذہن پھر اپنے سفیدوں پر منڈلانے لگتا تھا۔ یہ سفیدے جن کی
صورت اور قوت کا سارے علاقے میں چرچا تھا، جنھوں نے اونچی اونچی پھیلی
پھیلی جھاڑیوں اور بیلوں سے پٹی ہوئی زمینوں کو اُتھل پتھل کر دھر دیا تھا، جو
اس کے روشن دنوں اور اندھیری راتوں کے ساتھی تھے، جن کی ملکیت اس کے
لیے بہت بڑے تمغے کی حیثیت رکھتی تھی۔ ان سفیدوں کو وہ ایک زیادہ کڑی،
زیادہ شیریں اور زیادہ اٹل اور بے اختیار محبت کی بھینٹ چڑھانے جا رہا تھا کہ
اس کی تمنا تھی کہ حاکم کے حکم کے باوجود وہ ایک مرتبہ، ایک ہی مرتبہ، بس
آخری مرتبہ اپنے تیسرے کھیت میں ہل چلائے گا اور ایک بار پھر اُس تمکنت
غرور کا لطف اٹھائے گا جو کڑیل بیلوں کے پیچھے پیچھے خوبصورت ہل کی رنگین
ہتھی سے نوجوان دہقانوں کے دلوں میں جاگ اٹھتا ہے۔ ایک بار پھر وہ لچکتے
ہوئے ہل سے دھرتی کی چھاتی کو چاک کر کے اس نیم مردہ احساس کو زندگی بخشے
گا کہ ازل سے لے کر ابد تک اور پورب سے لے کر پچھم تک یہ زمین کسان کی
ہے، بادشاہ اور اس کے نائب اور اس نائب کے نائب سب کے سب اس کی
جان توڑ محنت کے ثمرات کے انتظار میں منہ کھولے بیٹھے ہیں۔ وہ اس کے
غیرفانی دسترخوان کے ازلی ریزہ چیں ہیں اور یہ زمین کی رگوں میں سرسراتی
ہوئی چمکتی ہوئی پھال مشیت کے قلم کی نوک ہے، جس کی تحریر اَمٹ ہے، اور
جس کے اُفق تک پھیلے ہوئے صحیفوں کا نگہبان کسان ہے، پیرو!

کھیت میں پہنچ کر اس نے ڈھلان کی چوٹی پر اپنے نامکمل گھروندے کا
سیاہ ڈھیر دیکھا، جس پر عنقریب چھت ڈالی جانے والی تھی۔ ڈھلان سے ملحقہ
کھیتوں میں گھس کر گیہوں کے نودمیدہ پودوں پر شفقت بھرے ہاتھ پھیرتا رہا،
اور پھر سفیدوں کو باہم جوڑ کر ہل لگایا اور کھیت کے ایک سرے سے بسم اللہ کر
کے سفیدوں کو چلنے کا اشارہ کیا۔ ایک بار پلٹ کر جب وہ نقطۂ آغاز کے قریب
آیا تو اس کا دل تسلی، بے فکری اور مسرّت کے جذبات سے لبریز تھا، اور وہ چلّا
اٹھا۔

"میرے سفیدو، میرے بچو، میرے سہارو، یہ تمہارا آخری ناچ ہے،
آج دھرتی کو اپنی قوت کے تمام کرشمے دکھا دو۔ ایک ایک ذرّے کو دُھن ڈالو۔
آنکھ کے ایک پلکارے میں پرلے سرے پر جاؤ، اور چٹکی بجاتے میں یہاں آ
جاؤ۔ یہ ہل تمہارا ساتھ دے گا، یہ تمہارا آخری معرکہ ہے۔ اس کے بعد تمہارا
پیرو ان زمینوں کے پپڑائے ہوئے ہونٹوں اور چٹخے ہوئے سینوں کو دیکھے گا اور
روئے گا۔ دوسری زمینوں پر فصلیں اگیں گی اور یہاں تونبے کی بیلوں کے جال
بچھیں گے اور خاردار جھاڑیوں سے اس ستھری زمین کا چہرہ داغدار ہو جائے گا۔
اور میں وہاں اس کالے بھجنگ گھروندے میں پڑا انہیں دکھ بھرے گیتوں سے
تھپکایا کروں گا —— شاباش تیز اَور تیز —— اَور بھی تیز۔"

اور اب سفیدے لوہے کے دو دہکتے ہوئے گولوں کی طرح کھیت کے
آر پار بجلی کی سی تیزی سے لڑھک رہے تھے۔ پسینے سے شرابور پیرو ہتھی پر
مضبوطی سے ہاتھ جمائے ان کے پیچھے دوڑتا پھر رہا تھا، اور ہنس رہا تھا، اور ہانپ
رہا تھا، اور تازہ مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو سے ہوا بوجھل ہوئی جا رہی
تھی۔ بینڈے جھاڑیوں میں چلّا رہے تھے اور جھاڑیوں نے جگنوؤں کی محفل سجا
رکھی تھی، کہ اچانک کھیت کے ایک کنارے سے کوئی بولا۔

"ہل روک لو۔"

"کون ہے؟" ہانپتا ہوا پیرو چلّایا——اور سفیدوں کے پیچھے لپکا،
گیا۔

"روک لو ہل" گرجدار آواز آئی۔

"ہل نہیں رکے گا۔" پیرو چنگھاڑا۔

"میں کہتا ہوں روک لو ہل۔"

"ہل نہیں رکے گا، ہل رکنے کے لیے پیدا نہیں ہوا، ہل چلتا رہے گا۔
ہل اناج کا خالق ہے، ہل خدا کا اشارہ ہے۔"

"میں کہتا ہوں روک لو ہل سؤر کے بچے۔"

اور پیرو کے ہاتھ سے ہتھی چھوٹ گئی۔ ہل ڈھیلا پڑ کر اڑتے ہوئے
سفیدوں کی ٹانگوں پر پڑا اور پھال کی نوک نے انہیں بری طرح زخمی کر دیا۔
ایک جگہ جا کر وہ رک گئے۔

"مجھے گالی کس نے دی ہے؟" پیرو آواز کی سمت معیّن کئے بغیر
اندھیرے میں گرجا——"کس نے دی ہے مجھے گالی؟"

اچانک بہت سے ہاتھوں نے اسے بالوں، ہاتھوں اور ٹانگوں سے پکڑ کر
جکڑ لیا۔ اور پھر ایک ٹارچ روشن ہوئی۔ یہ ٹارچ سیدھی پیرو کے منہ پر پڑی
اور وہ روشنی کے اس طمانچے سے بھونچکا سا رہ گیا۔

"میں تھانیدار ہوں۔" ٹارچ کا مالک بولا۔ "اور یہ سب میرے سپاہی
ہیں۔" ٹارچ لمبی نکیلی مونچھوں اور خوفناک چہروں پر گھومتی ہوئی آئی، اور پیرو
کے منہ پر ایک اور طمانچہ جڑ دیا۔

"اور تم——حرامزادے——تم میرے مجرم ہو——تم نے
میرا کہا نہیں مانا۔ تم نے میرے حکم کی خلاف ورزی کی ہے۔ اُس روز بھی
——تمہیں نے بکواس کی تھی۔ اور آج بھی تم ہی سارے گاؤں کے سامنے
ہل کاندھے پر رکھے اکڑے چلے آئے۔ جیسے حاکم ملک بدر ہو چکا ہے۔ بدذات

——چھین لو اس سے بیل، اور جماؤ اس کے بھیجے پر لاتیں، اس کی ماں——
اس کی بہن——"

وہ تھانیدار کی گالیوں کا جواب زیادہ وزن دار گالیوں میں دیتا، مگر
اپنے ارادوں اور امنگوں کی توڑ مروڑ اور چیخ پکار نے اس سے عزّتِ نفس کی
ساری قوّتیں چھین لیں۔

"یہ سفیدے میرے نہیں۔" وہ لاتوں، گھونسوں اور ٹھوکروں کی
بوچھاڑ میں گھِر کر بولا۔ "خدا کی قسم، یہ سفیدے میرے نہیں۔ یہ امانت ہیں
——یہ امانت مجھے بے حد عزیز ہے۔ امانت کس ایماندار کو عزیز نہیں ہوتی
تھانیدار جی۔ تم سفیدوں کو چھوڑ دو، مجھے ساتھ لے جاؤ۔ مجھے جیل میں ٹھونس
دو۔ میرے جسم کی بوٹی بوٹی کاٹ لو۔ مجھے گالیاں دو۔ مجھے ننگا کر دو سارے
گاؤں کے سامنے پر یہ سفیدے میرے نہیں۔ یہ صرف دو بیل نہیں، یہ ایک گھر
کی آبرو ہیں۔ یہ ایک معصوم جان کی خوشیوں کا اکلوتا سرمایہ ہیں۔ سفیدے
گاؤں کو واپس بھگا دو اور مجھے ساتھ لے چلو۔ میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔
سفیدے نہیں آئیں گے۔ کہہ دو کہ سفیدے نہیں آئیں گے۔"

جب اس کی آنکھ کھلی تو آسمان پر ستاروں کی محفل پوری شان سے سج
رہی تھی، اور ہوا کی خنکیوں نے فضا کو غنودہ کر دیا تھا۔ قریب ہی ایک جھاڑی
میں ٹڈا چلّا رہا تھا اور ایک جگنو اوپر ہوا میں تیرتا ہوا ڈھلان پر پیرو کے نامکمل
گھروندے کی طرف اڑا جا رہا تھا۔ پیرو سر جھٹک کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ دو تین بار
نہایت بے قراری سے ایڑیوں پر گھوما۔ جھینگروں کی پوری قوّت سے چلّایا۔

"تھانیدار جی۔" اور پہاڑیاں بج اٹھیں۔

"تھانیدار جی۔" اس نے دیوانوں کی طرح گلے سے باریک بھاری
اور بیٹھی بیٹھی آوازوں کا ایک طوفان اگل ڈالا——اور پہاڑیوں نے اس کے
اس دیوانہ پن پر تالیں بجا دیں۔

ایک دم وہ بھڑک کر دوڑا۔ پتھروں کو اُڑاتا، چٹانوں پر سے پھلانگتا، گھٹنوں اور کہنیوں کے بل قدم قدم پر گرتا، جھاڑیوں کے کانٹوں اور سوکھی ٹہنیوں میں کپڑوں اور پنڈلیوں کو اُدھیڑتا وہ وحشت ناک رفتار سے بھاگنے لگا۔

"تھانیدار جی۔" وہ کچھ دور جا کر چلّاتا اور پہاڑیاں تالیاں بجا دیتیں۔

وہ اِسی طرح دوڑتا رہا۔ اس کے گھٹنوں اور کہنیوں سے خون بہہ رہا تھا۔ اس کے بال اس کے چہرے پر بکھر گئے تھے۔ اس کا تہمد چیتھڑے بن کر پھڑپھڑا رہا تھا۔ پہاڑیاں اس کی ہر پکار پر قہقہے مارتی تھیں۔ پتھر اِدھر اُدھر لڑھک کر اور نیچے کھڈوں کے پتھروں کو چھیڑ کر گنگتے تھے، اور دور ——— کمّوں کے صحن سے ہوا، ایک گیت کے منتشر ٹکڑے اڑا کر اس کے آس پاس بکھیرتی جاتی تھی۔

❂

ہیروشیما سے پہلے
ہیروشیما کے بعد

لوگ کہتے تھے شمشیر خان وقت سے پہلے بوڑھا ہو گیا ہے۔ اس کی طبیعت کا تقاضا یہی تھا کہ اس کا چہرہ روشن اور اس کی داڑھی سیاہ رہے لیکن کچھ دنوں سے بڑھاپا اس پر اچانک برف کی طرح گرنا شروع ہوا اور اس کے سر کے بالوں اور داڑھی مونچھوں کو کھچڑی بنا گیا۔ بڑھاپے کی یہ آسیبی سفیدی اس کے لباس پر بھی اثر انداز ہوئی۔ بنارسی پگڑیوں، ریشمی لُنگیوں اور بوسکی کے کھلے اور ڈھیلے ڈھالے چولوں کی جگہ ململ کے پھینٹوں، ٹخنوں سے بالشت بھر اونچے تہمدوں اور کھدر کی کسّی کسائی بنگالی قمیضوں نے لے لی۔ چہرے کی لالی نچڑ گئی اور آنکھوں کے کناروں پر مکڑیوں نے ٹانگیں پسار دیں۔ اس انقلاب کے باوجود بچوں سے لے کر بوڑھوں تک اور کنواریوں سے لے کر بیواؤں تک سے اس کی چھیڑ چھاڑ بدستور جاری رہی بلکہ کچھ زیادہ ہی شدت اختیار کر گئی۔ جب وہ گلی کے نکڑ پر تیزی سے گزرتے ہوئے کسی نوجوان پر پھبتی کستا۔

"ارے بھئی وہ تو پنگھٹ پر جا چکی۔" یا چوپال کی پرلی طرف قبرستان کے ایک ویران گوشے میں کسی گبھرو کو دبکتا دیکھ کر پکار اٹھتا۔ "آج گاڑی لیٹ معلوم ہوتی ہے۔" تو لوگ بے اختیار ہنستے' اور خود شمشیر کے قہقہے ان سب سے بلند ہوتے۔ مگر ہر روز کوئی اس کی دکھتی رگ کو چھیڑ دیتا۔

"شمشیر چچا نہ جانے کیا بات ہے کہ پہلے تم ہنستے تھے تو یوں لگتا تھا جیسے کٹورے بج رہے ہوں' اور اب تم ہنستے ہو تو یوں لگتا ہے جیسے چٹانیں لڑھک رہی ہیں پربت پر سے۔ اور پھر نہ تمہاری آنکھیں چمکتی ہیں' نہ چہرہ دمکتا ہے۔ تم ہنستے ہو تو تمہارے پپڑائے ہونٹوں سے خون رسنے لگتا ہے۔ تمہارے ماتھے کی لکیریں گہری ہو ہو جاتی ہیں۔ آخر کیا بپتا پڑی ہمارے چچا پر کہ دنوں میں بجھ کر رہ گیا۔"

پربت کی چوٹی پر سے لڑھکتی ہوئی چٹانوں کا تانتا بندھ جاتا اور وہ کہتا۔

"یعنی مطلب یہ ہے تمہارا کہ ہم بوڑھے سرے سے ہنسنا ہی چھوڑ دیں' اور یہ نعمت بھی تم نوجوانوں کو سونپ دیں۔ کیوں بھئی. ہم نے بگاڑا کیا ہے تمہارا؟ ہم نے تمہیں سپرد کر رکھی ہیں محبتیں' اور راتوں کی ملاقاتیں اور تنہائیوں کے گیت اور لال چہرے اور لو دیتی پُتلیاں۔ اب یہ ہنسی بھی چھین لو ہم سے کہ ہم سچ مچ کے بے حیا بن کر رہ جائیں —— واہ ——! اور بھئی' یہ ایک کان سے عطر کی پھریری نکال کر ہمیں بھی تو سنگھاؤ —— کہتے ہیں' جس نے حنا کا عطر نہیں سونگھا' اسے ماں نے ابھی جنا ہی نہیں ——" اور چٹانوں کا ایک اور ریلا گڑگڑاتا ہوا اُمڈ پڑتا۔

لیکن لوگوں کا اندازہ غلط نہ تھا۔ اگرچہ وہ اس کی وجہ نہیں جانتے تھے' انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ اپنے بیٹے دلیر خاں کی شادی پر اس نے محض دکھاوے کی خاطر جو دھوم مچائی تھی اور سونے چاندی کے زیوروں کے جو انبار لگا دیئے تھے' وہ درحقیقت مہاجن کی بھرپور محبت کا نتیجہ تھے۔ اور شہنائیوں اور

گیتوں اور تہنیتوں کے ہنگامے کے بعد جب اس نے حالات کا جائزہ لیا تھا' تو ایک رات گھبرا کر پکار اٹھا تھا۔

"دلیر خاں دیا بجھا دو بھئی' تیل خواہ مخواہ جل رہا ہے۔"

ملحقہ کمرے کے دروازے کی روشن جھریاں اچانک مٹ گئیں اور اس نے لحاف لپیٹ کر سونے کی کوشش کرنا چاہی' مگر کروٹوں کے بہت سے دائرے بنانے کے بعد وہ اٹھ بیٹھا۔ اسے اندھیرے سے ہول آنے لگا۔ طاق پر سے دیا سلائی کی ڈبیا اٹھا کر اس نے چراغ جلایا تو ملحقہ کمرے سے آواز آئی۔

"کیا بات ہے آبا؟"

اور وہ جھنجلا کر بولا۔

"ارے ابھی تک جاگ رہے ہو تم لوگ؟" اور اس نے دِیا بجھا کر پھر لحاف کی پناہ ڈھونڈی۔

بار بار اس کے دماغ کو اس احساس کی ان گنت سوئیاں کریدنے لگتیں کہ وہ اپنی اچھی خاصی پونجی کو برباد کرنے کے علاوہ تین ہزار کا مقروض ہے' اور اب اس کا بیٹا نوجوان ہے۔ اس کی شادی بھی ہو چکی ہے۔ اب اس کے بچے ہونے لگیں گے۔ اخراجات بڑھتے جائیں گے اور زمینیں اجڑتی جائیں گی۔ پہلے سندھ کے پانیوں سے اس کی زمینوں پر ہر سال زندگی کی تازہ تہیں پھیل جاتی تھیں۔ اُن لوگوں پر اسے بہت ترس آتا تھا جن کی زمینیں دریا سے دور تھیں' جو ہمیشہ بارشوں کے محتاج رہتے تھے' بارشوں کے لیے مسجدوں میں دعائیں مانگتے تھے' غریبوں میں گڑ اور گُھنگھنیاں بانٹتے تھے' نفل پڑھتے تھے اور پھر مایوس ہو کر گالیاں دینے لگتے تھے؛ لیکن اب سندھ سے ایک بہت بڑی نہر نکالی جا رہی تھی اور دریا سمت اور ہٹ کر بہت دور بھورے پہاڑوں کے قدموں میں رینگ رہا تھا۔ چٹخی ہوئی شور زمینوں پر جب وہ مٹر کا اِکّا دکّا پودا دیکھتا' اور ڈھور ڈنگر ان دور دور تک بکھرے ہوئے پودوں کی تلاش میں مارے

مارے پھرتے تو وہ بہت دکھی ہو جاتا۔ زمینیں روز بروز بگڑتی اور اُجڑتی جا رہی تھیں، اور سندھ کا پانی ان وسیع تھلوں کے صدیوں کے سوکھے سڑے معدوں میں غرق ہو رہا تھا، جن پر نوابوں اور جاگیرداروں کا قبضہ تھا اور جو ان تھلوں سے بیگانہ رہ کر بھی پہلے سے نہایت شاداب ریاستوں کے مالک تھے۔

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔" اس نے ایک روز ذیلدار سے کہا تھا ——— "کچھ پلّے نہیں پڑتا کہ ایک ہزار غریب کسانوں کی زمین کو اجاڑ کر صرف ایک زمیندار کی آسودگی کا سامان کیوں ہو رہا ہے؟ بھئی یہ بات عجیب الٹی سی ہے۔ خدا کی ان نعمتوں میں تو ہر انسان برابر کا حصہ دار ہے۔ دریا کے پانیوں پر بھی کبھی کسی کا قبضہ ہوا ہے بھئی ذیلدار۔"

ذیلدار ورثے میں پائی ہوئی نیاز مندی کا مظاہرہ کرتا۔

"شمشیر خاں! سرکار جو چاہے کرے۔ چاہے تو تھلوں میں دریا بہادے چاہے تو ہرے بھرے کھیتوں میں آگ لگا دے۔ ایسی باتیں یوں کھل کر نہ کیا کرو۔ سرکار کو پتہ چلا تو دھر لئے جاؤ گے، اور بھئی خدا اور سرکار پر کون انگلی اٹھائے۔"

"مگر دریا کے پانی پر کسی کا اجارہ تھوڑا ہے۔" وہ حیران ہو کر کہتا۔

"سرکار چاہے تو ہوا پر بھی لگان لگا دے۔" ذیلدار حسبِ عادت سرکار کی وکالت کرتا۔

اور پھر شمشیر خاں کے دماغ میں خوش مزاجی کی رَو چلنے لگتی۔

"ہوا پر بھی لگان؟ سچ مچ بھئی اگر سرکار ہوا پر بھی لگان لگا دے تو عجیب تڑک پھڑک شروع ہو جائے۔ ہر پَل واویلا مچا رہے۔ ارے بھئی کیا ہوا؟ کیسا شور ہے؟ کچھ نہیں بھئی، اُدھر اُس گھر میں ہوا ختم ہو گئی ہے۔ سارے گھر والے تڑپ رہے ہیں۔ پانسو کے نوٹ دے کر میراسی کو شہر بھجوایا ہے کہ سرکار سے ہوا کے کنستر خرید لائے ——— ہائے ہائے ہائے! اور پھر ذیلدار ——— ایک بات

کہوں ——— یہ سامنے دادا شہباز بیٹھا ہے نا، ہوا پر لگان لگے تو سب سے پہلے یہی دم توڑے گا بچارا۔"

"کیوں؟" کوئی سوال کرتا۔

"ایک تو غریب ہے۔ صبح کی بگھاری ہوئی دال دوسرے دن شام تک چلتی ہے، اور دمے کا مریض ہے، اِدھر ہوا بند ہوئی، اُدھر دادا شہباز اناللہ ہوئے ——— کیوں دادا؟"

دادا شہباز پنشنر جو بڑھاپے کے آخری نقطے کو چھونے کے باوجود سچی بات اور مذاق سے باز نہ آتا تھا، پوپلے منہ کو کھجا کر کہتا۔

"ہم تو بھئی مٹکا بھر لیں گے ہوا سے، اور چھپا دیں گے اسے کوڑے کے ڈھیر میں۔ جب بھی ہوا نہ ملی تو کوڑا ہٹایا، مٹکے پر سے ڈھکنا کھسکایا بھبھڑے بھرلیے، اور پھر مٹکا بند ——— تجھے ایک بوند بھی دیں تو نام بدل ڈالنا۔ کنکوّا رکھ دینا ——— ہاں۔"

قہقہے پڑتے، تمباکو کے دھوئیں اڑتے، کھانسیوں کے پٹاخے چھوٹتے، شمشیر ہر کسی پر پھبتی کستا۔

"ابے آرام سے کھانس ——— ایسی کھانسی بھی کیا جیسے اونٹ کا گھُٹنا ٹوٹے۔"

"ابے حقّہ اِدھر گھما، جورو کی طرح لپٹ جاتا ہے اس سے ———"

"ابے سنبھل کر بیٹھ، تو نے تو دکان کھول رکھی ہے ———!"

مگر جب وہ گھر آتا تو تھلتھلاتے ہوئے پیٹ والا مہاجن دوہری ٹھوڑی میں تہرے بل ڈال کر اس کے کمرے میں کسی جھرّی کے رستے آنکلتا اور اندھیرے میں سوکھے سڑے پنجے اس کی طرف لپکتے، اور ملحقہ کمرے کی روشن جھریاں بل کھا کر سانپوں کی طرح رینگنے لگتیں۔

"دِیا بجھادو دلیر۔" وہ پکار اٹھتا۔ "تیل ضائع ہو رہا ہے ———" اپنی

ہی آواز سن کر وہ چونک اٹھتا۔ آدھی رات کو اٹھ کر صندوق کھولتا کہ شاید کسی
کونے میں کپڑے کی کسی سِلوٹ میں کوئی نوٹ اٹک کر رہ گیا ہو، اور پھر لحاف
کی پناہ گاہ میں گھس جاتا ـــــ صبح کو اٹھتا تو اس کی کنپٹیوں پر بالوں کا ایک اور
گچھا بھوسلا رنگ اختیار کر چکا ہوتا۔

"یعنی ہم بوڑھے ہو رہے ہیں۔" اس نے ایک روز سوچا، اور بنارسی
پگڑی اتار کر پلنگ پر پٹخ دی۔ اس کے بعد ہر روز سفیدی بوقلمونی کی جگہ لیتی گئی
اور لوگ حیران ہونے لگے کہ شمشیر پر بڑھاپا اچانک پہاڑ کی طرح کیوں ٹوٹ
پڑا۔

ایک روز پٹواری نے چوپال پر آکر خبر دی کہ انگریز نے جرمن کے
خلاف لڑائی کا اعلان کر دیا ہے، کمزور قوموں کی حفاظت کے لیے۔ شمشیر کی
آنکھیں چمک اٹھیں۔ خلافِ معمول اِتنے بڑے واقعہ پر خیال آرائی نہ کی بلکہ
چپ چاپ بیٹھا رہا۔ چہرے پر کئی رنگ آئے، گئے، اور پھر آ گئے ـــــ آخر اٹھا،
لپک کر گھر آیا، اور دلیر کو الگ لے جا کر کہا۔

"لام چھڑ گئی ہے۔ تو نے اُس روز کہا تھا کہ انگریزوں کا چھتری والا
وزیر خواہ مخواہ جرمن کو راضی کرنے کی دوڑ دھوپ کر رہا ہے۔ تو نے ٹھیک ہی
کہا تھا۔ شکر ہے تو نے مڈل تو پاس کر لیا، ورنہ ہم اَن پڑھ لوگ تو ساری عمر
اندھیر نگری میں بسر کر دیتے ہیں۔ تو بات یہ ہے دلیر بیٹا۔"

اُس نے ہزار چاہا کہ اعصاب کو قابو میں رکھے، اس کا رنگ نہ
بدلے، اس کے ہونٹ نہ کانپیں، اس کی بھویں نہ لرزیں، مگر اُس وقت اس کی
ذاتی غرض نے شفقتِ پدری کے خلاف لڑائی کا اعلان کر دیا تھا۔ ایک دم رک
کر وہ سیدھا ہو بیٹھا، اور پھر یوں بولا جیسے اس نے ساری عبارت برسوں سے
رٹ رکھی تھی ـــــ!

"بات یہ ہے دلیر بیٹا کہ پچھلی لام میں جو پڑھا لکھا نوجوان فوج میں

بھرتی ہوا، وہ واپس آ کر تحصیلدار اور صاحب ضلع اور کپتان پولیس بنا۔ ایسے
بھی کئی منصف میں نے دیکھے ہیں جو بات کرتے تھے تو یوں معلوم ہوتا تھا جیسے
فوج کو حملہ کا حکم دے رہے ہوں ـــــ تو اب میرے خیال میں اللہ کا نام لے
اور بھرتی ہو جا۔ موت سے ڈرنا جوانمردوں کا کام نہیں۔ یہ گھڑی تو مقرر ہے۔
ٹالے ٹل نہیں سکتی۔ جنگ کے طوفان سے لاکھوں بچ کر نکل آتے ہیں اور یہاں
کروڑوں کچا خربوزہ کھا کر یا چربی کا حلوہ ٹھونس کر یا ویسے ہی بیٹھے بٹھائے ہنستے
کھیلتے دم توڑ دیتے ہیں۔ چل چلاؤ تو لگا ہی رہتا ہے۔ تو پھر میرے بیٹے، میں چاہتا
ہوں کہ جب تُو لام سے واپس آئے تو بہت بڑا افسر بن کر آئے۔ لوگ تیرا نام
لیں تو میں فخر سے اکڑ جاؤں۔ یقین جانو، اِس طرح میرے سفید ہوتے ہوئے
بال پھر سے کالے ہونے لگیں گے۔ دل کا اطمینان سب سے بڑا خضاب ہے۔"

دلیر خاں فوجی سپاہیوں کے کھڑکھڑاتے ہوئے تہمد، دو گھوڑا بوسکی کی
قمیض، بنارسی پگڑیاں اور پھر عطر کی پھریریاں اور انگلیوں میں ناچتا ہوا سبک سا
بید، کلائی پر گھڑی، اور ان سب پر مستزاد فوں فاں اور ٹخ پخ۔ غرض وہ ہر بات
سے متاثر تھا اور یہ تأثرات اُس وقت بہت گہرے ہو جاتے تھے جب گاؤں کی
ہر اٹھتی جوانی عطر کی خوشبو اور انگریزی قسم کی نسواری مٹھائیوں کے چکّر میں آ
کر محض فوجیوں ہی کا اِجارہ بن چلی تھی۔ ساتھ ہی اسے باپ کے قبل از وقت
بڑھاپے کا بھی علم تھا اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ رات کو گھر میں دیر تک چراغ
جلانے کی ممانعت کیوں ہے!

مگر ابھی شاداں کے ناخنوں پر حنا کی ہلکی ہلکی لالی مٹنے نہیں پائی تھی،
اگرچہ اس نے شادی کے دس روز بعد ہی سارے گھر کا کام سنبھال لیا، اور نئی
نویلی سہاگنوں کے پرانے رواجوں کے برعکس گھر کی جھاڑ پونچھ کے علاوہ تالاب
سے سب گھر والوں کے کپڑے تک دھلواتی تھی، لیکن آخر وہ ابھی دلہن تھی۔
اس کی چوڑیوں کے چھناکے میں ترنّم تھا۔ اس کی آواز کی نرمی میں تازہ خون

کی طراری مترنم دھڑکنیں سی پیدا کرتی تھی۔ وہ قدم اٹھاتی تھی تو یوں معلوم ہوتا تھا جیسے دوسرا قدم زمین پر نہیں آئے گا، ہوا میں پڑے گا' اور وہ ابھر جائے گی اور ابھرتی چلی جائے گی۔ اس کی لانبی آنکھوں کو سرمے کی لکیر ابھی تک نیم خوابی کا خمار بخشے جارہی تھی۔

شرماتے وقت ابھی تک اس کا دایاں ابرو اوپر اٹھ کر کمان کا سا خم کھا جاتا تھا' اور گوری ٹھوڑی کی گولائی حباب کی طرح کپکپا اٹھی تھی۔ دلیر خاں کے نزدیک اِتنے بڑے سرمائے کو کھلا چھوڑ دینا بزدلی تھی۔ لیکن جب اعلانِ جنگ کے ساتھ ہی گاؤں نوجوانوں سے خالی ہونا شروع ہوا' اور چند لوگوں نے اس کی ہچکچاہٹ پر پھبتیاں بھی کسیں' تو وہ ایک صبح کو اپنے باپ سے آنسوؤں سے بھیگی ہوئی دعائیں لیتا اور شاداں کے سلگتے ہوئے لبوں کے گہرے گوشوں کا آبِ حیات پیتا گاؤں سے رخصت ہو گیا۔

دلیر خاں کے جاتے ہی گھر خالی خالی نظر آنے لگا۔ شاداں بھی اداس رہنے لگی۔ ہروقت پڑی کھاٹ توڑ رہی ہے۔ برتنوں میں چڑیاں ناچ رہی ہیں۔ آنگن میں کوّوں نے اودھم مچا رکھا ہے۔ سلیقے اور سُگھڑاپے کا سارا سحر ٹوٹ گیا۔ زیور اترنے لگے۔ ریشمی لہنگے کا کنارا زمین پر گھسٹتے گھسٹتے بے رنگ ہو گیا۔ آنکھوں میں بھُولے سے سرمہ پڑتا بھی' تو دن ڈھلے تک بہہ جاتا۔ شمشیر اسے دلاسا دینے کی کوشش کرتا' مگر جانتا تھا کہ جوانی میں محبت عبادت کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور پھر شاداں تو ویسے ہی مجبور ہے۔ اسے بہت زیادہ کام نہیں کرنا چاہیے ـــــ لیکن یہ اداسی' یہ آنسو' یہ جمائیاں؟ ـــــ"

"شاداں بیٹی' یہ بُرا شگون ہے' جوانمردوں کا کوئی وطن نہیں ہوتا۔ وہ عمر بھر نکھٹو بن کر گھر میں پڑے نہیں رہ سکتے۔ خدا کے لیے ہنس کھیل' مسکرا ـــــ سنتی ہے شاداں بیٹی؟"

شاداں شمشیر کی طرف یوں دیکھتی جیسے کہہ رہی ہو "ٹھیک ہے۔ ہنسنا

کھیلنا بڑی اچھی باتیں ہیں' مگر کس سے ہنسوں؟ کس کے ساتھ کھیلوں؟ بوڑھے چچا تم کیا جانو ـــــ تم کیا جانو؟"

شمشیر سب کچھ جانتا تھا۔ وہ ہر ہفتے دلیر کے خط کا جھوٹ تراشتا۔

"آج پھر خط آیا ہے" وہ کہتا۔ "لکھتا ہے' شاداں سے کہئے کہ میرے لیے دعا کیا کرے' اداس نہ رہے۔ گرج کڑک اور دھوآں دھار طوفان کے بعد مطلع صاف بھی ہو جاتا ہے' سورج بھی چمکتا ہے۔ ہری بھری گھاس بھی اُگتی ہے۔"

شاداں کو کبھی کبھی شک گزرتا کہ چچا جھوٹ بول رہا ہے۔ آخر اس نے چھ مہینے تو دلیر کے ساتھ گزارے تھے اور وہ جانتی تھی کہ دلیر مڈل پاس سہی پر اسے ایسی باتیں قطعی نہیں آتیں۔ اسے تو ماہیے' ڈھولے' ٹپّے اور دوہے کے سوا اور کچھ نہیں معلوم۔ یہ تو بڑی دانائی کی باتیں ہیں۔

اُدھر شمشیر کے ذہن میں شمشیر اور دلیر کے وزن پر کئی نام گھومنے لگے تھے۔ مگر ان سب میں شیر خاں اسے ایسا بھایا کہ وقت سے پہلے ہی گاؤں بھر میں اعلان کر دیا۔

"اور اگر لڑکی ہوئی؟" کسی نے پوچھا۔

"تو شیرنی۔" شمشیر نے جواب دیا۔

"میں کہتا ہوں اگر نہ لڑکا ہوا نہ لڑکی۔ تو؟" دادا شہباز پنشنر کے پوپلے منہ پر گول مول مسکراہٹ ناچنے لگی۔

"عورتیں لڑکے لڑکی کے سوا اَور بھی کچھ جَنتی ہیں کیا؟"

"ہاں ہاں۔"

"کیا؟"

"یہی لنگور گیدڑ' بندر۔"

لوگ سنجیدہ ہو گئے' کیونکہ موضوع عام نہیں تھا بلکہ خاص شاداں سے متعلق تھا' اور شہباز حسبِ عادت زیادتی پر اتر آیا تھا' مگر شمشیر نے کہا:

"بھئی چچا' مذاق کا کوئی رنگ روپ بھی تو ہونا چاہیے۔ یہ کیا کہ ڈھیلا کھینچ مارا اور کہا کہ ہم مذاق کر رہے تھے۔"

"منشی جی سے پوچھ لو۔" دادا شہباز ہار کب مانتا تھا۔ "امرت سر میں ایک عورت نے بندر جنا ہے۔ زندہ ہے۔ ہسپتال میں ہے۔ ماں کا دودھ پیتا ہے البتہ دُم ذرا چھوٹی ہے۔"

دادا شہباز کا مذاق برداشت کی حد سے باہر ہو چلا تھا' مگر شمشیر کو وہ دن نہیں بھولے تھے جب اُس نے دادا شہباز کی ایک موٹی تازی شرمیلی بہو کے پیٹ کو تھپتھپا کر کہا تھا۔

"خضر کی عمر اور سکندر کا بخت پاؤ——اب آ بھی جاؤ نا۔"

اور جب بچہ پیدا ہوا تو وہ سچ مچ شیر ہی نکلا۔ بڑے بڑے ہاتھ پاؤں' موٹا سر' گول چہرہ' گورا رنگ——"ہے دادا شہباز۔" مارے خوشی کے اس کے گلے سے اکٹھی آٹھ دس آوازیں نکل گئیں۔ "سنتے ہو؟ شیر پیدا ہوا ہے شیر۔"

"چچ چچ چچ۔" دادا شہباز نے ہمدردی کی۔" ہائے ہائے ہائے انسان کے گھر میں حیوان' تیرے کھیل نیارے ہیں رے مولا۔ لڑکی ہی ہوتی۔ پر یہ شیر' یہ دُم والا شیر۔شمشیر میں تمہارے کسی کام آ سکتا ہوں؟"

بوڑھے کو بازو سے پکڑ کر گھر لے آیا' ننھا دکھایا' اور پھر اس کے منہ میں مصری کی ڈلی ٹھونس کر بولا۔ "سیدھی طرح مبارک دے ورنہ دوسری ڈلی سے باچھیں چیر ڈالوں گا۔"

شہباز چُوکنے والا کب تھا۔ مصری کو ایک طرف کے جبڑے میں سنبھال کر بولا——!

"ہم سولہ سترہ روپے کے بدلے فرانس کے میدانوں میں جانیں دینے جا نکلے تھے۔ مصری کی ڈلی کے بدلے باچھیں چر گئیں' تو وارے نیارے

ہیں ہمارے۔ جانیں دیتے مبارک——" اور پھر سنجیدہ ہو کر اس نے شمشیر پر مبارک بادوں کی بوچھاڑ کر دی۔

دلیر ابھی جھانسی ہی میں تھا کہ اُسے باپ بن جانے کی اطلاع ملی۔ فوراً ریشمی کپڑوں کی ایک گٹھڑی پارسل بھجوادی۔ اِدھر شاداں کو ہنسنے کھیلنے کا بہانہ ہاتھ آگیا۔ اُدھر شمشیر کے چہرے کی جھرّیاں مسرّت کی لہروں میں بدلنے لگیں' اور اس کی حسِّ مزاح تیز ہونے لگی۔ اب اسے ہر مہینے بیٹے کی طرف سے بیس روپے مل جاتے تھے اور وہ ہر روز مہاجن کی دکان کے سامنے سے گزرتے ہوئے کہتا تھا!

"بس ایک سال چاچا——ایک ایک کوڑی چکا دوں گا——پر دیکھیو وہ جو تم پچاس پچاس کے پانسو اور ہزار کے دس ہزار بنا لیتے ہو نا؟ وہ جادو کا کھیل مجھے نہ دکھانا۔ میں مداریوں سے نفرت کرتا ہوں۔"

مہاجن ہنستا' یہ ہنسی پہلے تو اُس کی چُندھی آنکھوں میں چمکتی' پھر گالوں کے انبار میں ہونٹوں کا شگاف بنتا اور پیٹ نیم بسمل مرغے کی طرح تڑپنے لگتا۔ پیٹ کے کافی دیر تک تڑپنے کے بعد اس کے حلق میں گڑگڑاہٹ پیدا ہوتی۔ سانسوں میں کُشتیاں ہوتیں اور قہقہہ' کھانسی' چھینک اور چیخ کا ایک مرکب بن کر اس کے نتھنوں اور ہونٹوں سے ایک دھماکے کی طرح ابل پڑتا۔ اور پھر ایک زُہرہ گداز ڈکار کے بعد مہاجن کہتا۔

"بڑے پاپی ہو تم۔"

شمشیر خان اکثر کہا کرتا تھا کہ مہاجن کا قہقہہ سب سے پہلے اس کے معدے میں بیدار ہوتا ہے۔ چربی کی ایک تہ سے سر نکال کر اِدھر اُدھر دیکھتا ہے۔ ابھرتا ہے' مگر جب ٹھوڑی تک پہنچتا ہے، تو بھٹک جاتا ہے۔ ایک حصہ نتھنوں اور دوسرا منہ کے راستے باہر نکلتا ہے۔ تیسرا حصہ ٹھوڑی کی گدگدی آرام گاہ میں لیٹ جاتا ہے اور جب مہاجن ہنس چکتا ہے تو یہ بقیہ حصہ ڈکار بن جاتا ہے

بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ مہاجن کے قہقہے کی طرح اس کی زندگی کا
ہر پہلو اور اس کی ہر حرکت ایک طویل عمل کی عادی بن چکی تھی۔ لال لا
پوتھیوں کے ٹاکروں میں سیاہ روشنی کی ننھی ننھی بندیاں کئی گھروندوں کی تباہی
کی ضامن تھیں۔ اور ہر رات کڑوے تیل کی روشنی میں ان بندیوں میں اضافہ
ہوتا رہتا تھا۔ اور پھر وہ نہایت سبک سے چاقو کی کھرچنی اور وہ گھسا ہوا موم اور
"ہرے رام ہرے رام۔"

ایک روز شمشیر کو دلیر کا خط ملا کہ وہ ننھے شیر خاں کو دیکھنے کے لیے حد
سے زیادہ بے تاب ہے مگر سرکاری حکم کے مطابق وہ کسی نامعلوم مقام کو جانے
کے لیے آج کل کراچی میں ہے۔ وہاں سے باقاعدہ خطوط لکھتا رہے گا۔ چند
روز کے بعد شمشیر کو معلوم ہوا کہ دلیر سمندر پار جاچکا ہے اور اپنی تین چوتھائی
تنخواہ اس کے نام لکھوا گیا ہے۔ شمشیر کا مقصد پورا ہو رہا تھا لیکن وہ پٹواری سے
ہٹلر کی فاتحانہ یلغاروں کے قصّے ہر روز سنتا تھا اور ان لوگوں پر اسے بہت رحم
آتا تھا جو اس گرجتی گونجتی اور بجلی کی سی تیزی سے بڑھتی ہوئی فوج کے مقابلہ پر
ڈٹے ہوئے ہیں۔

"کچھ سنا شمشیر خاں۔" ایک روز پٹواری نے اسے ایک خبر سنائی۔
"دس دن ہوئے میں نے تجھے بتایا تھا کہ جرمن دنیا کے سب سے خوبصورت شہر
پیرس میں داخل ہو گئے۔ اب آج کی خبر ہے کہ فرانس نے جرمنی کے سامنے
ہتھیار ڈال دیئے۔"

"دس دن میں سارے فرانس پر قبضہ ——" شمشیر بولا ——
"حلوے کی طرح نگل گیا کمبخت۔"

"فرانس ہے بھی حلوہ ——" دادا شہباز چہکا ——
"میٹھا میٹھا، تر و تازہ، رنگ برنگا۔"

اچانک شمشیر سیدھا بیٹھ گیا۔

"یہ فرانس کہیں دور ہے نانشی جی۔ کراچی سے کوئی جہاز اگر 11 جون
کو چلے تو 22 جون تک فرانس پہنچ سکتا ہے کیا؟"

اسے تسلی دی گئی کہ دلیر ابھی فرانس نہیں پہنچ سکا ہو گا۔ مگر اب ہر
روز پٹواری اسے ایک وحشت ناک خبر سناتا، اور اس کے چہرے پر جھرّیاں پھر
سے اُبھرنے لگیں۔

"انگلستان پر ہر روز تڑا تڑ حملے ہو رہے ہیں۔ مکان جل رہے ہیں۔
عمارتیں گر رہی ہیں۔ ملبے کے نیچے سے عورتوں اور بوڑھوں بچوں کی لاشیں،
اور خون کے چھینٹے، انگریزوں کے خون کے چھینٹے، ہمارے حاکم کے خون کے
چھینٹے۔!"

"بھئی، سمجھ میں نہیں آتی یہ بات۔" ایک سادہ دہقان نے حقّے کے
لیے تمباکو مسلتے ہوئے کہا۔ "انگریز بھی مرتے ہیں کیا؟"

شمشیر کو جی بہلاوے کے لیے ایک موضوع ہاتھ آگیا۔

"نہیں —— نہیں میرے عزیز، انگریز کہاں مرتا ہے۔ انگریز تو قطب
صاحب کی لاٹھ ہے۔ ساگوان کا شہتیر ہے۔ فولاد کا ڈھانچہ ہے۔ میرے بھائی،
انگریز بھی تو ہم جیسا انسان ہے۔ فرق صرف اِتنا ہے ناکہ وہ گورا ہے اور ہم ذرا
سانولے ہیں۔ اس کے پاس جہاز ہیں، ہمارے پاس اونٹ۔ اس کے پاس
بندوقیں ہیں، ہمارے پاس لاٹھیاں۔ اس کے پاس کپڑے کی مشینیں ہیں
اور ہمارے پاس بوستان جولاہے کی کھڈی، جس میں اس کا ننھا بچہ گر کر اللہ میاں
کے ہاں سدھار گیا تھا بیچارہ۔ اور پھر انگریز کے پاس چرچل ہے اور ہمارے پاس
دادا شہباز، جو آوے کا ڈھلانی موڑ کاٹتا ہے تو ایک قدم پر پندرہ بار کھانستا ہے
اور جس کی بیگھہ بھر زمین میں سے سرکاری سڑک گزرنے والی ہے۔"

اور پھر پٹواری نے ہر روز ایک تازہ پھڑکتی ہوئی خبر سنانا شروع کی۔

"آج گاندھی جی نے انگریز سے اپیل کی ہے کہ وہ جرمنوں پر اپنا دروازہ کھلا چھوڑ دے اور ان سے کسی قسم کا لین دین نہ کرے۔ جرمن خود ہی تنگ آکر واپس جرمنی چلے جائیں گے۔"

"واہ رے میرے ملنگ سائیں' تیری دور بلائیں۔" شمشیر حاشیہ آرائی کرتا۔" دشمن کے ایک چٹکی تک نہ لو' تو پھر دشمنی کاہے کی۔ دروازہ کیوں کھلا چھوڑ دو' لٹھ کیوں نہ جماؤ تالو پر کہ بُھرکس نکل جائے۔ ہائے کتنا جی چاہتا ہے کہ گاندھی چرخے کے تکلے پر سوت کاتنے کی جگہ اس سے کسی دشمن کی آنکھ نکال لیتے——"

"دنیا کہاں سے کہاں نکل گئی۔" —— دادا شہباز نے کہا۔ "اور اِدھر سے حکم ملتا ہے' کھڈیاں بناؤ۔"

بات معقول تھی مگر وہ شمشیر ہی کیا جو دادا شہباز کی بات نہ ٹوکے۔ "تم نے یہ بال کڑکتی دھوپ میں سفید کئے ہیں دادا—— ہو سکتا ہے کھڈیوں کے بہانے مورچے بنوائے جا رہے ہوں۔"

"اور یہ دروازے کھلے چھوڑ دو؟"

"یعنی اندر آتے ہی دبوچ لو۔"

"اور یہ چرخہ چلاؤ؟"

"یعنی چرخہ چلاتے ہوئے کسی سے چل جائے تو تکلا چبھو دو' ہتّھی دے مارو کلّے پر۔"

"لٹھ کیوں نہ دے مارو کھوپڑی پر؟"

"اِس طرح دشمن خفا ہو جاتا ہے نا بھولے دادا—— ہاں تو منشی جی کوئی اَور خبر؟"

"انگلستان نے فرانس کے بیڑے پر قبضہ کر لیا ہے' زبردستی۔"

"یعنی گاندھی جی کی نصیحت نہیں مانی!"

چوپال پر گپوں اور قہقہوں کے ہجوم میں وہ بہت حد تک پرانے شمشیر کے روپ میں اجاگر ہو جاتا' مگر گھر لوٹتے ہی اس کا ضمیر اس کے چٹکیاں لیتا۔ دلیر کو جنگ پر بھیجنے کا مقصد اس کے سامنے آتا تو وہ اپنے آپکو نہایت کمینہ' ذلیل اور خود غرض محسوس کرتا۔ پریشان ہو کر اندھیرے میں آوارہ پھرتا رہتا' اور جب کہیں چین میسّر نہ آتا تو صندوق کھول کر دلیر کا بھیجا ہوا روپیہ گننے لگتا۔

انہیں دنوں دلیر کا خط آیا کہ وہ اب مصر میں ہے اور خوب مزے میں ہے اور مصری اذان بڑی سریلی ہوتی ہے اور مصری لوگ بڑے اچھے ہوتے ہیں اور ہم روز تماشے دیکھتے ہیں' سَیریں کرتے ہیں اور—— " یعنی جنگ کا ذکر تک نہ تھا۔ شاداں نے یہ سنا تو شیر کو اچھالتی ہوئی صحن میں بھاگ گئی اور شمشیر خط کو دوبارہ اور سہ بارہ پڑھوانے کے لیے پٹوار خانے کے چکّر کاٹنے لگا۔

"اٹلی نے سمالی لینڈ پر حملہ کر دیا۔" ایک دن پٹواری نے خبر سنائی۔

"سمالی لینڈ مصر کے قریب ہی ہے۔"

"ارے۔"

"ایک ہزار جرمن ہوائی جہازوں نے انگلستان پر حملہ کیا۔"

"خدا کی پناہ۔ یعنی ٹڈی دَل ہوائی جہازوں کا!"

"اٹلی نے مصر پر حملہ کر دیا۔"

"——"

گاؤں والوں کی زندگی میں یہ پہلا موقعہ تھا کہ انہوں نے شمشیر کی آنکھوں میں آنسو دیکھے۔ وہ چپ چاپ چوپال پر سے اُٹھ کر گھر کو چل دیا۔ اپنے کمرے میں آکر اس نے صندوق کھولا اور دلیر کی کمائی کو فرش پر بکھیر کر بچوں کی طرح رونے لگا۔ وہاں سے اٹھ کر دھم سے پلنگ میں گر پڑا۔ شاداں بھاگی آئی تو شمشیر بولا۔

"نہ جانے اب تک کیا کچھ ہو چکا ہو گا۔ دعا کر بٹی' دعاؤں کا تانتا

باندھ دے۔ اِتنی دعائیں مانگ کہ اللہ میاں کے دربار میں شور مچ جائے۔ رو رو کر، بلک بِلک کر، سِسک سِسک کر دعائیں مانگ، دلیر کی زندگی کے لیے دعائیں مانگ، اور مجھ پر لعنتیں بھیج کہ میں نے قرض اتارنے کے لالچ میں اپنے اکلوتے لعل کو آگ کی بھٹی میں جھونک دیا۔ یہ نہ سوچا کہ میں اُجڑ جاؤں گا۔ یہ نہ سوچا کہ شاداں میری اچھی بیٹی کا سہاگ ابھی نیا نویلا ہے۔ یہ نہ سوچا کہ——"

اس کا گلا رندھ گیا اور وہ سر کو تکیے پر رکھ کر رونے لگا۔

شاداں مچل گئی۔ شیر کو فرش پر بٹھا کر شمشیر کی پیٹھ پر دونوں ہاتھ رکھ کر بولی۔

"میرے چچا، کچھ بتاؤ تو سہی آخر—— کیا ہوا؟ کچھ تو کہو۔"

شمشیر نے بازو سے اپنی آنکھوں کو چھپا کر کہا۔

"دلیر مصر میں ہے اور مصر پر اٹلی نے حملہ کر دیا ہے۔ اب وہاں جہاز بم برسا رہے ہوں گے، توپیں چل رہی ہوں گی، بندوقوں کی تڑ تڑا اور گرد و غبار اور دھوآں اور دھائیں دھائیں—— میرا نازوں سے پالا دلیر، میری حرص کا شکار دلیر، میرے دلیر، میرے——" وہ پھر رونے لگا۔

چھ مہینے تک شمشیر اور شاداں کے آنسو خشک نہ ہوئے اور دعائیں بند نہ ہوئیں۔ مزاروں پر دیئے جلے۔ بھکاریوں میں گڑ بانٹا گیا۔ بکرے قربان ہوئے۔ دونوں ایسے حواس باختہ ہو گئے کہ رات کو گھر میں دیا تک نہ جلتا اور اگر جلتا تو جلتا ہی رہتا۔ کپڑے مَیل سے اَٹ جاتے تو یونہی رسماً تھوپ تھاپ کر الگنی پر ڈال دیئے جاتے۔ شیر بیمار پڑتا تو کسی آتی جاتی بڑھیا سے دوا پوچھ لی جاتی۔ چوپال پر پٹواری سے لوگ نئی خبروں کا تقاضا کرتے تو وہ کہتا۔ "بھئی نئی خبریں تو بہتیری ہیں، پر اگر چچا شمشیر نہ ہو تو بات کا سارا مزا کرکرا ہو جاتا ہے۔ اسے آنے دو۔"

مگر شمشیر کو اب چوپال پر بیٹھ کر گپیں ہانکنے کی فرصت ہی کہاں تھی۔

وہ نوجوان تک اداس ہو گئے تھے جن پر نہایت کڑی مگر شگفتہ تنقید کر کے وہ قہقہوں کا طوفان مچا دیتا تھا۔

چھ مہینے کے بعد اسے دلیر کا خط ملا کہ لڑائی میں اس کے کندھے پر معمولی سے زخم آئے تھے اور اب وہ تندرست ہو کر عنقریب "انڈیا" آنے والا ہے۔

"انڈیا؟" اس نے پٹواری سے پوچھا۔

"ہاں—— یعنی ہندوستان۔"

"یہ انگریزی ہے؟"

"ہاں۔"

"یعنی دلیر اب انگریزی بھی جانتا ہے؟"

"یہی معلوم ہوتا ہے۔"

"اری شاداں بیٹی!——" وہ گھر آ کر پکارا—— "کچھ سنا——؟ دلیر انگریزی بھی بولنے لگا—— اور اب واپس آ رہا ہے—— اور دیکھ—— وہ مرغی پھر رہی ہے نا۔ گوری سی، بانجھ کمبخت، جو بڑے نخروں کے ساتھ تین مہینے بعد ایک ذرا سا انڈا بر آمد کرتی ہے، اسے ذبح کرا لے اور ساتھ ہی گورمکھ کی دکان سے جوشی چاول لے آ—— اور دیکھ، بڑے مٹکے میں جو گڑ پڑا ہے نا، وہ بچوں میں بانٹ دے—— ہاں——"

باہر گلی میں آ کر وہ خواہ مخواہ ایک نوجوان کے پیچھے پڑ گیا۔

"ارے طرّے باز! ارے بائیں مڑتے ہوئے دائیں دیکھنے والے، بات سن۔ پگڑی کو اِتنی کلف نہیں لگانی چاہیئے کہ اچھی خاصی ملائم ململ ٹین کا پترہ بن کر رہ جائے۔"

شمشیر پھر چوپال کی رونق بن گیا۔

"جنگ کی کوئی نئی خبر؟" اس نے پٹواری کو مخاطب کرتے ہوئے

پوچھا۔ "کوئی تروتازہ خبر ہو بھئی۔ ننھے ننھے گاؤں اور چھوٹی موٹی کھاڑیاں اور تل بھر کے جزیرے —— نہ نہ، بہت ہو چکیں یہ باتیں۔ کوئی ایسی خبر سناؤ منشی جی کہ اوسانوں کو ٹھکانا ملے۔"

دادا شہباز ایک بڈھے سے کسی بلغم توڑ نسخے کے اجزاء پوچھ رہا تھا، یکایک چونکا اور کھسک کر شمشیر کے سامنے آ گیا۔

"کیا کہا میاں شمشیر، ہائے ہائے ہائے، انسان بھی کتنا طوطا چشم ہے، قرآن کی قسم —— ارے تمہارا دلیر مصر میں تھا تو تم وہاں کے ہر ٹیلے کی خبر سنتے تھے اور اب تمہارا دلیر مصر سے واپس آ رہا ہے تو تم ننھے منے گاؤں اور چھوٹی موٹی کھاڑیوں کا ذکر ہی نہیں سنو گے؟ کوئی بہت بڑی خبر سنو گے تم؟ تو بھئی جنگ کی بہت بڑی خبر تو وہی ہوتی ہے نا جس میں اَن گنت انسان کھیت رہیں، اور میاں شمشیر، جو جوان تمہیں بہت بڑی خبر سنانے کے لیے جان دیں گے، اُن کے بھی تو باپ ہوں گے، اُن کی بھی تو نئی نویلی بیویاں ہوں گی، اور معصوم بچے، پیارے دوست، اور ہمدرد رشتہ دار۔ ان کی امیدیں اور ان کے حوصلے۔ چاہے وہ جرمن ہوں چاہے انگریز چاہے ہندوستانی۔ میں انسانوں کی بات کر رہا ہوں۔"

شمشیر کا چہرہ ایک خوفناک ندامت آمیز سنجیدگی کے ہالے میں گھر گیا۔ مٹی ہوئی جھرّیاں پھر سے ابھر آئیں۔ پہلو بدلا، اور سر پر ہاتھ پھیر کر شہباز کی طرف دیکھا۔

"تم ٹھیک کہتے ہو چچا۔" اس کی آواز کھوکھلی تھی، اور بج رہی تھی، اور اُس میں گھبراہٹ کے اتار چڑھاؤ تھے۔ "میں نے تو ویسے ہی بات کی تھی کہ —— بات یہ ہے دادا، کہ تم ٹھیک کہتے ہو۔"

"میں نے غلط بات کب کہی ہے؟" شہباز الجھ رہا تھا۔

"صرف اب۔" شمشیر موضوع کو بدلنا چاہتا تھا۔

لوگ ہنس پڑے۔

"میرا مطلب ہے، مَیں نے کبھی نہیں کہی۔"

"سچ بات۔" شمشیر نے دادا شہباز کا فقرہ پورا کر دیا اور چوپال قہقہوں سے گونج اٹھا۔

مگر شہباز اپنے احساسات کی تلخی سے ابھی پیچھا نہیں چھڑا سکا تھا، بولا۔

"تم مجھ سے بہت چھوٹے ہو شمشیر، اور تم نے مجھ سے کم دنیا دیکھی ہے۔ پچھلی لام کو ان آنکھوں سے دیکھ آیا ہوں۔ سینکڑوں جرمنوں کو موت کے گھاٹ اتارا، اور سچ کہتا ہوں، دشمن کی ہر لاش سے میرے دل کا ایک ٹکڑا چپک کر رہ گیا۔ اندھیری، گرجتی، دھاڑتی راتوں میں مردہ جسموں سے ٹھوکریں کھائیں، اور ٹھوکریں کھا کر گرا بھی لاشوں پر۔ کسی کی انتڑیاں باہر پڑی تھیں، کسی کا بھیجا چٹان پر بکھر گیا تھا، کسی کی ٹانگیں غائب ہیں، کوئی مرنا چاہتا ہے، اور مر نہیں سکتا، کوئی جینا چاہتا ہے مگر جی نہیں سکتا۔ میں نے ایک روز ایک لاش دیکھی، جرمن سپاہی تھا۔ اتنا خوبصورت تھا کہ مورت چھاپ لینے کو جی چاہے۔ میں نے اس کی جیبیں ٹٹولیں، تو اندر سے سنہری بالوں کا ایک گچھا نکلا۔ اور کسی پھول کی چند سوکھی پتیاں، اور ایک مُڑی تُڑی تصویر —— ایک لڑکی کی —— جس کی آنکھیں اتنی گھمبیر تھیں، قرآن کی قسم کہ جہان ڈوب جائے؛ اور اس کی آنکھیں جیسے پوچھ رہی تھیں:

"سچ مچ کیا تم واپس نہیں آؤ گے؟" میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ توپوں کی دھائیں دھائیں اور دھوئیں اور دھول کی اس دنیا میں میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میں نے یہ تینوں چیزیں اُس کی جیب میں ڈال دیں۔ اس کے چہرے کو دیکھتا رہا۔ اور میاں شمشیر، میری بات سننا، مَیں سچ کہتا ہوں، مَیں چیخ کر پیچھے ہٹ گیا۔ اس کے منہ سے اچانک چند مکھیاں نکلیں، اور اس کے نیلے ہونٹوں اور ننھی ننھی سنہری مونچھوں پر بیٹھ کر پر سنوارنے لگیں —— یہ

نوجوان بھی تو دنیا کو بہت بڑی خبر سنانے کے لیے مرا —— اور میں نے ان تمام خونوں کے بدلے سات روپے پنشن پائی —— یہ سات ٹھیکریاں —— یہ سات لعنتیں —— " دادا شہباز کی آواز بھرا گئی اور وہ لاٹھی سنبھالتا چوپال پر سے اتر گیا۔

"دادا۔" شمشیر نے اسے پکارا۔

وہ بغیر مڑے بولا۔

"میں پاگل ہو جاؤں گا' مجھے جانے دو۔"

"دادا۔" شمشیر ننھے بچے کی طرح پکارا۔ اور پھر سر جھکا کر بیٹھ رہا۔ ایک مجرم کی طرح' شرمندہ اور نڈھال —— جیسے دنیا کی ساری جنگوں کا ذمہ دار صرف وہی ہو۔

صبح کو اٹھا تو شاداں کے چہرے پر غیر معمولی تازگی دیکھ کر اس کا احساسِ مسرت پھر سے جاگ اٹھا' اور جرمن سپاہیوں کی لاشیں ایک طرف سرک گئیں۔

"دلیر آ رہا ہے —— دلیر مصر سے بخیریت آ رہا ہے۔" اس کی ذاتی تسلّی کے لیے یہی خیال کافی تھا اور دادا شہباز کی بھرائی ہوئی آواز اور ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں' "اور میں پاگل ہو جاؤں گا۔" بڑھاپا کتنا ذکی الحس ہوتا ہے' اس نے سوچا۔

بڑھاپا کتنا ذکی الحس ہوتا ہے' اس نے ایک مرتبہ پھر سوچا۔ یعنی دلیر آ رہا ہے' تو آ کر واپس بھی تو جائے گا۔ اور واپس لاہور یا دلّی تو نہیں جائے گا' جنگ پر ہی جائے گا۔ اور جنگ سے انسان ایک مرتبہ بچ نکلے تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ ہمیشہ بچتا چلا جائے۔

دادا شہباز! قتلے کر ڈالوں تیری زہریلی زبان کے —— بات کیا تھی اور تُو نے کہاں پہنچا دی!

اُس نے بہت کوشش کی کہ مسکرائے' قہقہے لگائے' پھبتیاں کسے' مگر اس کے ذہن پر اچانک ایک خوبصورت چہرہ ابھرتا اور پھر نیلے ہونٹوں اور سنہری مونچھوں پر مکھیاں بھنبھناتیں' اور کلیجے میں کرچ سے سنگین پیوست ہو جاتی اور انتڑیاں باہر اُبل پڑتیں —— وہ شاداں سے کہتا۔

"بٹی کوئی بات سناؤ۔" مگر وہ مسکرا کر پیاز کاٹنے لگتی۔

"ارے بھئی کوئی بات سناؤ۔" —— "وہ گلی کے نکڑ پر بیٹھے ہوئے لوگوں سے کہتا۔

"دلیر کب آئے گا؟" سوال کا جواب سوال ہی میں ملتا۔

"دادا کوئی بات سناؤ —— " اس نے چرکے لگانے والے شہباز سے مرہم کی التجا کی۔

"بات؟" بڈھے نے پوچھا۔ "یعنی کوئی بہت بڑی خبر؟"

اور شمشیر کے جی میں آئی کہ ہڈیوں کے اس ڈھانچے کو توڑ مروڑ کر بول میں پھینک آئے۔

چند روز بعد اسے دلیر کا خط ملا کہ وہ گھر نہیں آئے گا۔ کراچی میں اترتے ہی اس کی رجمنٹ رنگون چلی جائے گی اور رنگون سے سنگاپور جانے کا قصد ہے۔

"دلیر نہیں آ رہا —— " ایک دھماکے کی طرح یہ الفاظ اس کے لبوں سے نکلے' اور شاداں جو مسالہ رگڑ رہی تھی' دم بخود ہو کر دیوار سے لگ کر بیٹھ گئی۔

"دلیر نہیں آ رہا' وہ رنگون جا رہا ہے۔" اس نے دادا شہباز کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے چوپال پر اعلان کیا۔

"بہت بڑی خبر ہے بھئی۔" دادا شہباز کی لَے ابھی نہیں ٹوٹی تھی۔

شمشیر بگڑ گیا۔

"دیکھو دادا، بہت لحاظ کیا تمہارا۔ تم چند دنوں سے ہاتھ دھو کر میرے پیچھے پڑ گئے ہو۔ یہ اچھی بات نہیں۔ میں تمہارے سفید بالوں کی عزت کرتا ہوں ورنہ۔" اور وہ غصے سے کانپتا ہوا چوپال پر سے اٹھ آیا۔

پٹواری نے آواز دی۔

"جنگ میں یونہی ہوتا ہے چچا۔"

اور شمشیر نے پلٹ کر پٹواری کی طرف یوں دیکھا، جیسے بس چلے تو اس کی کھوپڑی اُدھیڑ کر رکھ دے۔

لیکن اس روز ایک شہباز یا پٹواری کیا، وہ سارے گاؤں سے بگڑ گیا۔ شاداں تک کو گھُرک دیا۔

"لوہے کی زبان ہوتی تو شاید مرچیں اثر نہ کرتیں، مگر اب تو گلے سے ناف تک جلتا ہوا فتیلہ رکھ دیا ہے تمہارے سالن نے —— بُڈھوں کو جان سے مارنے کے اَور بھی تو طریقے ہیں۔ کفگیر جما دو کنپٹی پر۔ کڑاہی دے مارو ماتھے پر —— لے جاؤ، میں نہیں کھاؤں گا۔"

مگر آہستہ آہستہ وہ سنبھلتا گیا۔ اس کا بیٹا رنگون میں تھا اور اس کے خیال میں یہ ناممکن تھا کہ جنگ مغرب سے ہٹ کر ہزاروں میل کی الٹی زقند بھرے اور مشرق کے مرغزاروں میں ناچنے لگے۔ "مشرق میں کیا پڑا ہے۔" پٹواری نے کہا تھا۔ "مشرق کے لیے دوسرے بم اور توپیں تھوڑی ہیں کہ اب یہ تکلف بھی کیا جائے۔"

"ایک جاپان ہے۔" دادا شہباز نے جہاندیدہ سیاست دان کے انداز میں کہا تھا "سوگنجی نہائے گی کیا اور نچوڑے گی کیا۔ برسوں سے سر پٹخ رہا ہے، پر یہ افیمی ابھی تک اس کے مقابلے میں ڈٹے ہوئے ہیں-اور بھئی جاپانی مال تو تم جانتے ہی ہو۔ جاپانی کھلونے۔ اِدھر بچے کے ہاتھ میں آئے اُدھر دانت نکال بیٹھے۔ اور جاپانی ریشم کے کپڑے۔ ایک تاگا لٹک آئے تو سمجھو سارا تانا بانا

اشارے کا منتظر ہے۔ ان کے جہاز بھی تو ٹین کے بنے ہوتے ہیں، اور ان کے سپاہی ٹھگنے، ناٹے۔ تم یوں جما کر ان کی کھوپڑی پر تھپڑ مارو تو زمین میں دھنس جائیں۔"

"نہیں نہیں" پٹواری نے دادا شہباز کو ٹوکا تھا۔" یہ بات تو نہیں دادا۔ مگر جنگ ابھی اِدھر نہیں آئے گی۔ جنگ زندہ لوگ لڑتے ہیں۔ لاشوں نے بھی کبھی لڑائیاں کی ہیں بھولے بادشاہ۔"

ادھر دلیر کے خط پہ خط آ رہے تھے۔ رنگون کے پگوڈے، برما کے جنگل۔ ناریل اور کیلے، اور —— "ہم بڑے مزے میں ہیں۔ رنگون، برما کی جنّت ہے۔ جنگ نہ ہوتی تو مَیں شاداں، شیر اور آپ کو یہاں بلا لیتا۔"

شمشیر پٹواری کے پاس دوڑا آیا۔

"کیا رنگون میں بھی جنگ ہو رہی ہے منشی جی؟"

پٹواری نے کان پر قلم دھر کر کہا۔

"یہ جنگ کہاں نہیں ہو رہی چچا۔ جنگ صرف توپ، بندوق کی تو محتاج نہیں۔ بھوک کی بھی جنگ ہوتی ہے۔ غلامی کی بھی جنگ ہوتی ہے۔ انتظار کی بھی جنگ ہوتی ہے۔ جنگ ہر جگہ ہو رہی ہے۔ رنگون میں بھی ہو رہی ہے اور ——

اور —— ہمارے گاؤں میں بھی ہو رہی ہے؛ یہ ازلی و ابدی جنگ۔ یہ جنگ جو کبھی ختم نہ ہو گی۔ یہ جنگ جو دریا سے نہریں نکالتی ہے، جو سبز کھیتوں میں سے سڑکیں گزارتی ہے، جو پانی پر لگان لگاتی ہے، جو پولیس کے سپاہی کو نمرود کے اختیارات بخشتی ہے، جو غریبوں کے کھدر میں جُوئیں ڈالتی ہے، جو امیروں کے ریشم تلے گٹھیا کی صورت میں پروان چڑھتی ہے۔ تم ہر روز جنگ جنگ پکارتے ہو، جنگ ہر جگہ جاری ہے۔ ہماری زندگی خود ایک جنگ ہے۔"

"مگر جنگیں ختم بھی تو ہوتی ہیں۔"

"نہیں ـــــ کئی ایسی جنگیں بھی ہیں جو قیامت تک جاری رہیں گی۔
اب یہ جنگ ختم ہو گی تو ایک نئی جنگ آدھمکے گی۔ وہ امن کی جنگ ہو گی۔
امن قائم کرنے کے لیے تجارت کی جنگ ہو گی۔ تجارت بڑھانے کے لیے
سمندری راستوں کی جنگ ہو گی۔ ان کے عقب میں انسان کے پیدائشی حقوق کی
جنگ ہو گی' اور جب یہ جنگ ہو گی ـــــ جب یہ جنگ ہو گی ـــــ" اور
پٹواری نے کان پر سے قلم اٹھا کر اِدھر اُدھر دیکھا اور بولا ـــــ "کھتونی کہاں
گئی؟"

چند روز کے بعد اس نے پٹواری سے خبر سنی۔

"جاپان نے امریکہ پر حملہ کر دیا۔"

اور پھر اتنے ہی روز بعد اسے معلوم ہوا کہ جاپان نے سنگاپور لے لیا۔

مگر دلیر تو رنگون میں تھا اور رنگون سنگاپور سے بہت دور ہے۔ گھر آ کر
اس نے شیر کو اٹھایا اور صحن میں ٹہلنے لگا۔

"تیرا ابّا رنگون میں ہے اور جنگ ہو رہی ہے سنگاپور میں۔ اور سنگاپور
بہت دور ہے رنگون سے۔"

بچے نے ناک پر ہاتھ رگڑ کر دادا کے بال پکڑ لیے' اور جب بڑی مشکل
سے اس نے بچے کی گرفت ڈھیلی کی تو بچہ رونے لگا۔ شاداں بھاگی آئی۔ وہ رو
رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کے ڈوروں میں خون تھا۔ اس کے گالوں میں خون
تھا۔ اس کے ہونٹوں پر خون تھا۔ اُس وقت سورج غروب ہو رہا تھا۔ شمشیر نے
محسوس کیا کہ ساری کائنات پر انسانی خون کے چھینٹے بکھر گئے ہیں۔ لاشیں پہیوں
تلے چیخ رہی ہیں۔ کھوپڑیاں فضا میں اُڑتی پھر رہی ہیں۔ کسی آسیبی ہاتھ نے اُفق
پر سے لپک کر کھیتوں کی ہریاول کو نچوڑ لیا ہے اور ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا
ہے' جس میں تازہ خون کی بو ہے۔ سڑتی ہوئی لاشوں کی بو ہے۔ جھلسے ہوئے
چمڑے کی بو ہے۔

"دِیا جلاؤ۔" وہ پکارا۔

کچھ دیر تک انتظار کرنے کے بعد وہ بھڑک کر اٹھا اور صحن میں جا کر
چنگھاڑا۔

"شاداں! میں بک رہا ہوں ـــــ دِیا جلاؤ۔"

وہ اُس وحشت ناک خاموشی کو برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ دانت بھینچ
کر چلایا۔

"دِیا جلاؤ شاداں' مجھے اندھیرا نگل جائے گا۔"

دروازے پر کسی کی دستک ہوئی۔

"کون ہے؟"

وہ اُسی شدّت سے پکارا' اور دروازے تک گیا۔ مہاجن کی ٹھوڑی
جھٹپٹے میں تھیلی کی طرح لٹک رہی تھی۔

"اب کے تم نے قسط نہیں دی۔"

"نہیں دوں گا قسطیں" شمشیر نے کواڑ پر گھونسا جما کر کہا۔ "کب تک
دیتا رہوں گا قسطیں؟ میں نے تمہاری قسطوں کے لیے اپنا بچہ موت کے منہ میں
ڈال دیا۔ اپنے آنگن کی رونق لٹوا دی۔ اپنی روح کو نچوڑ کر تیری پیاس بجھانی
چاہی پر تیری پیاس نہیں بجھے گی۔ تو نے میرے دلیر کو رڑکا۔ اب تو میرے شیر کو
بھی چبائے گا ـــــ جا نہیں دیتا قسطیں۔ بتا دے جا کر اپنے ہوتوں سوتوں کو
ـــــ نالش کر دے ـــــ"

پیچھے سے شاداں نے آ کر اسے کھینچ لیا۔

"آپ کس سے بول رہے ہیں! سیٹھ تو چلا گیا۔"

"دِیا کیوں نہیں جلایا تم نے؟"

"جلایا ہے۔"

"کہاں جلایا ہے؟ ـــــ کدھر ہے؟ ـــــ جلایا ہوتا تو ـــــ"

مگر دِیا جل رہا تھا اور دِیے کی روشنی میں شاداں کی آنکھیں جل رہی تھیں۔ خود شمشیر کا سارا وجود جل رہا تھا۔ وہ دھم سے بستر پر جا گرا۔ بہت دیر کے بعد کروٹ بدلی۔ اُٹھ بیٹھا۔ سر کو دبایا اور ہولے سے بولا۔

"شاداں بیٹی' ذرا اِدھر آ کر دِیا بجھا دے' تیل ضائع ہو رہا ہے خواہ مخواہ۔"

دلیر کی خاموشی اَور خطرناک ثابت ہوئی۔ قسم قسم کے وسوسے شمشیر کو پریشان کرنے لگے۔ شاداں گھلتے گھلتے کانٹا بن گئی۔ اسکا دودھ خشک ہو چلا تھا۔ پڑوس کے دھوبیوں سے وہ بکری کا دودھ خرید لاتی تھی مگر شیر ہُمک کر ماں کے سینے سے چمٹ جاتا۔ اُدھر پٹواری نت نئی اور خطرناک خبریں سنانے لگا۔ دادا شہباز شمشیر کو بہلانے کے کئی جتن کرتا۔ مگر شمشیر مَری ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ ٹال جاتا۔ ہر روز مدرسے جاتا۔ جب ماسٹر جی ڈاک کھولتے تو وہ بت بنا ایک طرف کھڑا رہتا۔ "تمہارا خط نہیں آیا چچا۔" ماسٹر جی کہتے' اور وہ سر جھکائے گھر کو پلٹ آتا۔

ہر صبح کو مدرسے میں سارا گاؤں جمع ہوتا تھا۔ سب اپنے اپنے بیٹوں' بھتیجوں' نواسوں اور پوتوں کے خط لینے آتے اور دکھوں کی گٹھڑیاں اٹھا کر واپس جاتے۔اور پھر ایک دن اچانک ڈاک کے بھرے بھرے تھیلے میں سے سرکاری خطوط کا ایک ڈھیر سا برآمد ہوا۔ ایک خط شمشیر کے نام بھی تھا۔ اسے سرکار نے اطلاع دی تھی کہ دلیر جاپانیوں کا قیدی ہو چکا ہے۔

خط کھلتے جاتے تھے اور آنکھیں بھیگتی جاتی تھیں۔ اچانک ایک بوڑھے نے چٹاخ سے اپنی گنجی کھوپڑی پر ہاتھ مار کر کہا۔

"میں اُجڑ گیا۔"

اور پھر ہر طرف سسکیاں اور فریادیں اور شیون ـــــ ڈاکخانہ ماتم کدہ بن گیا۔ کوئی جنگ میں مارا گیا تھا۔ کسی کا کچھ پتہ نہیں تھا۔ کوئی جاپانی قیدی

تھا۔ آن کی آن میں گاؤں کے بہت سے گھروں میں واویلا مچ گیا۔ چھاتیاں کوٹی جانے لگیں۔ بال نوچے جانے لگے۔ گلیوں میں بھگدڑ مچ گئی۔

"جنگ ہر جگہ ہے۔"

شمشیر کے کانوں میں پٹواری کے الفاظ گونج رہے تھے۔

"شاداں ـــــ شاداں ـــــ" اور صحن کے کونے میں بیٹھی ہوئی شاداں نے سر اٹھایا۔ اس کی آنکھیں سُوج رہی تھیں اور کھلے بال زمین کو چُھو رہے تھے۔

"مَیں سن چکی ہوں۔" اس نے بلکتے ہوئے کہا۔

"شیر کہاں ہے؟" شمشیر نے پوچھا۔

"پڑا ہو گا کہیں۔" شاداں گھٹنوں میں سر دے کر رونے لگی۔

شیر اندر کمرے میں ایک کھٹولے کے نیچے لڑھکتا پھر رہا تھا۔ اس کے منہ میں مٹی تھی اور بالوں میں تنکے اٹک گئے تھے۔ شمشیر نے اسے اٹھایا' چوما؛ چوم چوم کر اسے نڈھال کر دیا' اور پھر اسے شاداں کے پاس بٹھا کر بولا۔

"یہ سب میرا کیا دھرا ہے۔ مجھ بوڑھے کا۔ مجھ خنّاس کا۔ بیٹے کو یوں جنگ میں بھیجا جیسے جہاد کا حکم مل چکا ہے ـــــ مَیں ـــــ مَیں ـــــ" مگر اس نے اچانک محسوس کیا کہ یہ مقام اور یہ موقعہ ایسی باتوں کا نہیں۔ پلٹ کر اپنے پلنگ پر آیا۔ وہاں سے اٹھ کر مرحوم نوجوانوں کے والدین کے پاس جا نکلا۔ ایک گھر میں اسے پٹواری مل گیا۔ بولا۔

"بڑا افسوس ہوا چچا۔"

شمشیر نے بازو اٹھا کر انگلیوں کو ایسا چکر سا دیا جیسے کہہ رہا ہو "قسمت۔"

"جب تم اپنے کلیجوں کے ٹکڑوں کو جنگ کی بھٹی میں جھونک رہے تھے تو تمہیں یہ کسی نے نہ بتایا کہ ـــــ" اُس وقت ذیلدار فاتحہ خوانی کے لیے

آنکلا اور پٹواری دبک کر دیوار سے لگ گیا۔

جاپان کی فاتحانہ یلغار برق رفتاری سے بڑھ رہی تھی۔ اُدھر جرمنی نے اتحادیوں کے چھکّے چھڑا دیئے تھے۔ مگر اب گاؤں والے بالکل بے حس تھے، جیسے جنگ کے ساتھ ان کی دلچسپی اور وابستگی ان کے بیٹوں اور پوتوں کی وجہ سے تھی۔ اور جب وہ کٹ مرے، یا قیدی ہو گئے تو جنگ ختم ہو گئی۔ باہر چراگاہوں میں ریوڑ چرنے جاتے، تو ان کے پیچھے بوڑھے بوڑھے گڈریئے ہوتے، کھانستے اور ہانپتے ہوئے —— کھیتوں کی رکھوالی کرنے والیاں اپنے بھائیوں اور خاوندوں کی یاد میں دھیمے سُروں میں گاتیں اور روتیں۔ چوپالوں پر الاؤ کے اردگرد دہقان چپ چاپ بیٹھے رہتے۔ گلیوں میں خاک اڑتی۔ ٹھنڈی کنواری صبحوں کو بوڑھیوں کی سسکیاں اور کھانسیاں داغدار کر دیتیں۔ پھولتی ہوئی شفق کے کلیجے میں خرخراتے ہوئے گلے والے عمر رسیدہ مؤذن کی آواز برچھے کی طرح گھس جاتی۔ زندگی جیسے پاؤں گھسٹتی پھر رہی تھی۔ ماری ماری، خانماں برباد اور پریشان حال، گھومتی اور چکراتی ہوئی، اونچی گگروں پر رکتی اور گہری کھاڑیوں میں ٹھٹکتی ہوئی —— لال گالوں اور چمکتی آنکھوں اور سُریلے گیتوں کی تلاش میں —— مگر لال گالوں کو گِدھ نوچ کر لے گئے تھے، چمکتی آنکھیں مصر کے ریگستانوں اور برما کے جنگلوں میں بجھ چکی تھی اور سُریلے گلوں کا رس صحرائی مکھیوں نے چوس لیا تھا —— اور جنگ جاری تھی —— عوام کی جنگ —— جمہوریت کی جنگ —— نوعِ انسان کی آزادی کی جنگ —— اور دریائے سندھ سے ایک بہت بڑی نہر نکالی جا رہی تھی اور دادا شہباز کی ایک بیگھہ زمین پر سے پکّی سڑک گزرنے والی تھی۔ اشیائے خوردنی نابود ہو رہی تھیں۔ ایک ہندوستانی نے ایک یورپین نازنین کے بوسے کے عوض ہزاروں روپیہ کا چندہ جنگ میں دیا تھا، اور مہاجن شمشیر کے پیچھے سائے کی طرح لگ گیا تھا۔

"تھوڑی سی رقم ہی تو باقی ہے، چکا دو، مجھے نیا دھندا شروع کرنا ہے۔" "نیا دھندا ——!" پٹواری نے کہا تھا۔ "یعنی اناج کے ذخیرے اور ریزگاری کی تھیلیاں اور ——"

"نہیں —— نہیں ——" مہاجن نے ٹھوڑی کے بلوں میں سے مَیل کی ایک مروڑی نکال کر کہا تھا —— "مَیں کانگریسی ہوں، مَیں ایسا نہیں کروں گا۔"

"ہے شمشیر چچا —— جیسے ہر گاؤں والا پکار رہا تھا —— ارے کچھ بولو، کوئی پھبتی، کوئی مذاق، کوئی لطیفہ —— کچھ سناؤ بھئی ورنہ ہماری روحیں بجھ جائیں گی۔ ہمیں نوجوان بھائی اور بھتیجے اور پوتے راتوں کی خاموشیوں میں آ کر ستاتے ہیں۔ لال لال آنکھیں نکال کر ہمیں اپنے پھٹے ہوئے پیٹ، کٹے ہوئے بازو اور نچی ہوئی رانیں دکھاتے ہیں اور کہتے ہیں ——" مبارک ہو، مبارک ہو، مبارک ہو۔" ہے شمشیر چچا! کوئی بات سناؤ، ہمارے کانوں میں ہمارے عزیزوں کی کراہیں برمے کی طرح گھُسی جا رہی ہیں۔ ہماری بیوہ بہنیں، ہماری لٹی ہوئی بیٹیاں، ہمارے کچلے ہوئے بچے —— شمشیر چچا، ہے شمشیر چچا!"

مگر شمشیر چچا پر تو کوئی اَور دُھن سوار تھی۔ وہ اب چپ چاپ رہنے لگا تھا۔ ہر روز ڈاکخانے میں جانا اس کا معمول ہو گیا تھا۔ وہاں سے ناکام لوٹ کر وہ پٹواری کے پاس چند لمحے گزراتا۔ اور پٹواری کے زرد سوکھے ہوئے چہرے میں دھنسی ہوئی بڑی بڑی بے رونق آنکھیں چمچما اٹھتیں۔

"یہ جنگ کبھی ختم نہیں ہو گی۔ یہ جنگ کرۂ ارض کی آخری جنگ ہے۔ اس جنگ میں آدم کی اولاد جل بُجھ کر بھسم ہو جائے گی، اور پھر اس راکھ سے ایک نئے آدم کی تعمیر ہو گی جس کی اولاد صحیح انسان ثابت ہو گی۔ وہ ایک گھر کی آبادی کے لیے بیس گھر نہیں اجاڑے گی۔ وہ ایک انسان کو موٹر مہیا کرنے کے لیے سینکڑوں انسانوں کی ٹانگیں نہیں کاٹے گی۔ ساری دنیا کی پیداوار ساری دنیا

کے باشندوں کی ملکیت ہو گی۔ اُس وقت، چچا شمشیر —— صرف —— صرف اُس وقت —— صرف تبھی ——" اور وہ کان پر سے قلم اٹھا کر کہتا۔

"کھتونی کہاں گئی؟"

مہاجن کی دکان کے سامنے سے گزرتا تو مہاجن لجاجت سے کہتا۔

"بھئی چکا دو نا باقی حساب۔ اب نیا دھندا شروع کرنا ہے؛ اور پھر اب تو تمہارا بیٹا قیدی ہے، اس کی ساری تنخواہ تمہارے نام آتی ہو گی۔"

اب تو تمہارا بیٹا قیدی ہے!

اب تو تمہاری قسمت جاگ اٹھی!

اب تو تمہاری برسوں کی تمنّا پوری ہوئی۔

اب تو تمہاری پانچوں گھی میں ہیں! لعنت ہو؛ شمشیر کو ہر کوئی چڑ کے لگاتا تھا۔ دادا شہباز بھی، جو کہتا تھا —— "آ جائے گا، قیدیوں کو تو بادشاہیاں بڑے آرام سے رکھتی ہیں، دلیر ضرور آئے گا ——" دادا شہباز اس سے مذاق کرتا تھا۔

آہستہ آہستہ گاؤں پر سکون چھاتا چلا گیا، مگر اِس سکون میں زندگی کم تھی اور موت زیادہ۔ ہواؤں میں بیواؤں کی آہیں اور یتیموں کی کراہیں تھیں۔ کھیتوں کا رنگ زہر کی طرح کٹیلا تھا۔ مویشی تک اداس نظر آتے تھے۔ ہر جمعرات کو چوپال سے پرے گاؤں کے قبرستان میں بزرگوں کی قبروں پر چراغوں کی قطاریں جلنے لگیں۔ ہر ماں، ہر بیوی اور ہر بہن جمعرات کو مٹی کے دِیوں میں تیل بھر کر بزرگوں کے پاس جاتیں، ان کے سرہانے دِیئے رکھ کر دعائیں مانگتیں۔

"میرا بیٹا واپس آئے، میرا مالک واپس آئے، میرا بھیّا واپس آئے ——"

"کوئی واپس نہیں آئے گا۔" پٹواری نے کہا تھا۔ "مَیں کہتا ہوں، تم جن بھائیوں اور بیٹوں کو واپس بلا رہی ہو، وہ کبھی واپس نہیں آئیں گے۔ وہ مر چکے ہیں یا مر رہے ہیں۔ ان کے ذہن مر چکے ہیں۔ ان کے عقیدے مر چکے

ہیں۔ ان کے جسم شاید واپس آ جائیں، لیکن وہ اپنی روحوں کو وہیں دفن کر آئیں گے۔ اور اِس لیے جب وہ واپس آئیں گے تو تمہارے بھائی اور بیٹے نہیں ہوں گے؛ وہ دھرتی کے بیٹے ہوں گے۔ اور جب میکسیکو میں کسی حبشی پر کوئی امریکن گولی چلائے گا تو درد کے مارے وہ چلّا اٹھیں گے۔ جب شنگھائی میں کوئی جاپانی کسی چینی کے تھپڑ مارے گا تو وہ بلبلا اٹھیں گے، جب دلّی میں کوئی گورا کسی ہندوستانی کے بھیجے پر لات جمائے گا تو وہ تڑپ اٹھیں گے اور پکار اٹھیں گے، اور ان کی پکار ہندوستان سے نکل کر لندن کے قلعوں سے ٹکرائے گی۔ واشنگٹن کے محلوں میں گونجے گی —— ماسکو کے ——"

"میرے خیال میں یہ پٹواری یا بم بنانے لگے گا یا قید ہو جائے گا۔" ذیلدار نے ایک روز تنگ آ کر کہا تھا۔

پٹواری کی باتیں پُر سکون تالاب کی سطح پر گرتے ہوئے ننھے ننھے سنگریزوں کی مانند تھیں۔ لہروں کے دائرے اپنے محیط وسیع کرتے ہوئے پھیلنے لگتے، اور مٹ جاتے، اور پھر تالاب سو جاتا —— ایک سال گزر گیا۔ دو سال گزر گئے؛ کبھی کبھی یورپ کے محاذ سے کسی نوجوان کی موت کی خبر آتی، تو اس تالاب میں چٹان سی گر پڑتی۔ تالاب تلملا کر رہ جاتا۔ لہریں دیر تک اس کی سطح پر ناچتی رہتیں، اور پھر سکون چھا جاتا —— سکون، جو ہر انجام کا آغاز ہے۔

ٹھیک ہی تو ہے۔ وہ بیوائیں جن کے پریشان بال، خشک ہونٹ اور چھلکتی ہوئی آنکھیں دیکھ کر کائنات بھی سسکیاں لینے لگتی ہے۔ وہ بہنیں جن کی چیخ پکار کا خلوص غیرفانی اور ابدی معلوم ہوتا تھا —— اب ترنجنوں میں چرخے گھماتیں، چہلیں کرتیں، قہقہے لگاتیں، ٹھوکے مارتیں اور رہتیں۔

"تیری اوڑھنی کا رنگ تو بالکل نئے نئے خون کا سا ہے بہن نوری۔"

"اور تیری لونگ، اِتنی اچھی ناک پر اِتنی بھونڈی لونگ، جیسے مصری کی ڈلی پر کوڑا اٹک کر رہ جائے ——" ناکوں، آنکھوں، بالوں اور اوڑھنیوں کے

گورکھ دھندے میں گِھری ہوئی یہ بیویاں اور بہنیں مصر کی ریتوں اور برما کی پٹاور میں گلی ہوئی ہڈیوں کو فراموش کر چکی تھیں۔ صرف ماؤں کی محبت زندہ تھی۔ یہ ابدیت سے بھی گہری اور لامحدود محبت، جو انقلاب کا نام نہیں جانتی، جو خدا کی طرح اٹل ہے —— اندھیری شاموں میں جب یہ بوڑھی مائیں پلّو تلے دِیئے چھپا کر بزرگوں کی قبروں پر جاتیں اور جب مقبروں پر سجے ہوئے دِیئے، جواب تعداد میں بہت کم رہ گئے تھے، ہوا کے جھونکوں میں اپنی آتشیں زبانیں تھرتھراتے اور قریب بیٹھی ہوئی ماؤں کے فق چہرے میں دھنسی ہوئی آنکھیں شہابِ ثاقب کی طرح چمک اٹھتیں تو شمشیر جس کی خاموشی اس عرصہ میں آوارگی کی صورت اختیار کر چکی تھی، لپک کر گھر آتا اور ننھے شیر کو پاس بٹھا کر شاداں سے کہتا۔

"بیٹا آج جمعرات ہے۔ دِیا تو جلا دیا ہوتا مزار پر۔ کون جانے اسی تیل کے صدقے خدا ہمارے گھروندے کو پھر سے روشن کر دے——" تو شاداں انگڑائیوں کا تانتا باندھ کر اٹھتی اور کہتی۔

"بہت دِیئے جلائے چچا، اور پھر دِیئے بجھ جاتے ہیں تو تیل مجاور الٹ کر لے جاتے ہیں۔ دِیئے جلانے سے کیا ہو گا؟"

شمشیر کے لیے دلیر کی دوری اب اِتنی تشویشناک نہیں رہی تھی، جتنا شاداں کا تغیّر۔ دلیر کی قید کے پہلے ہی سال کے آخری مہینوں میں اس کے دبلے پتلے جسم میں تازہ خون دوڑنے لگا تھا۔ صبح سویرے بناؤ سنگار میں کتنی دیر لگا دیتی۔ بہترین لباس پہنتی، شیر کو گھُرکتی اور پڑوس میں دھوبیوں کے گھر چلی جاتی۔ ہر مہینے دلیر کی تنخواہ سے دس روپے شمشیر سے جبرا" لے لیتی۔

"مجھے بھی زندہ رہنا ہے۔" وہ کہتی۔ "مہاجن کا حساب شیطان کی آنت بنتا چلا جائے تو میرا کیا بس—— میرا بھی تو حق ہے۔"

شمشیر چپ چاپ دس روپے ہر مہینے اس کے حوالے کر دیتا۔ وہ جانتا

تھا کہ جنگ میں صرف جانیں ہی نہیں، آبروئیں اور عزّتیں بھی ملیا میٹ ہو جاتی ہیں۔

"سنبھلو، سنبھلو۔" دادا شہباز کہا کرتا تھا۔ "سنبھلو شمشیر، چوکنّے ہو کر رہو، آخر دوسروں کے بیٹے بھی تو قیدی ہیں۔"

مگر شمشیر کو سنبھلنے کی توفیق ہی کہاں تھی۔ وہ ہمیشہ کے لیے ڈگمگا چکا تھا۔ اس لٹّو کی طرح جو فرش پر گرتا ہے تو ایک جگہ قرار نہیں پا سکتا۔ اس کی نوک کو جیسے زمین کے اندر سے کوئی چیز اچھال کر پرے پھینک دیتی ہے۔ اسے کوئی مرکز نہیں ملتا۔ کوئی منزل میسر نہیں آتی۔ سنبھلنے کے لیے فرصت چاہیے، اور شمشیر کے پاس بہت کم فرصت تھی۔ مہینے میں محاذِ جنگ سے ایک دو مَوتوں کی خبر آ جاتی، تو فاتحہ خوانی کے لیے چلا جاتا۔ لوگ امن کے لیے قرآن مجید کے ختم کراتے تو ان میں شامل ہو جاتا، اور جب پلٹتا تو پٹواری کہتا۔

"امن؟ امن تو صرف ایک لفظ ہے۔ امن جنگ کا دوسرا نام ہے، اور امن کی جنگ اصلی جنگ سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔ بنگال کا قحط کیا تھا؟ یہ امن کی جنگ تھی۔ یہ ہر چیز کی گرانی؟ یہ امن کی جنگ ہے۔ یہ اغواء اور زنا کے نت نئے شوشے؟ یہ امن کی جنگ ہے—— امن—— تم امن کے لیے دعائیں مانگتے ہو؟ حالانکہ تم دو صدیوں سے امن کے مزے لوٹ رہے ہو، دو صدیوں سے تم اس چپ چاپ جنگ میں مبتلا ہو، ایسی جنگ جو تمہارا خون نہیں بہاتی، صرف تمہارے دماغ اور دل کو نچوڑ کر گلے ہوئے چیتھڑے کی طرح پرے پٹخ دیتی ہے—— ارے یہ کھونٹی کہاں گئی؟"

مگر اب جنگ کی تازہ خبریں حوصلہ افزا ثابت ہو رہی تھیں اور شمشیر پٹواری سے بحث کرنے لگا تھا۔

"ارے بھئی امریکی فوج جزیرہ فلپائن پر اتر آئی ہے نا—— جنگ کو ختم سمجھو۔"

"یہ نئی جنگ کی ابتداء ہے۔" وہ کھتونی کو گھٹنے تلے رکھ کر کہتا۔

"روسی برلن میں گھس گئے۔"

"یہ نئی جنگ کی ابتداء ہے۔"

"مسولینی کو سُولی پر چڑھا دیا گیا۔"

"یہ نئی جنگ کی ابتداء ہے۔"

"یورپ میں جنگ ختم ہو گئی۔"

"اب نئی جنگ شروع ہو گی۔"

"جاپان کے شہر ہیروشیما پر ایک نیا بم گرایا گیا —— ایٹم بم —— ذیلدار کہہ رہا تھا۔"

"مجھے معلوم ہے۔"

اُس روز شمشیر کی آنکھیں چمک اٹھیں اور ہونٹوں کی پپڑیاں اچٹ کر رہ گئیں۔ مدت کے بعد اس نے پھبتی اور مذاق کی طرف توجہ دی۔

"بڑی دیر کے بعد نظر آتے ہو بھئی۔" اس نے ایک نوجوان سے کہا۔ "سناؤ آج کل کونسی گُپھا آباد کر رکھی ہے۔"

اور پھر۔" ابے کُھل کر قدم اٹھا۔ یوں چل رہا ہے جیسے تہمد کھل گیا ہو تیرا۔"

ایٹم بم کی خوشی میں اُس روز اس نے ایک بڑھیا پر بھی حملہ کر دیا۔

"لہنگا سنبھال خالہ' بلاوا دے رہا ہے۔"

بڑھیا پلٹ کر کھڑی ہو گئی اور پھر رو دی۔

"تم سچے ہو شمشیر' تمہارا دلیر واپس آ جائے گا —— اور میرا احمد —— وہ اُدھر تین سال ہوئے مصر میں ——" اور وہ روتی ہوئی وہیں بیٹھ گئی۔

"تم مجھ سے مذاق کرتے ہو؟ —— کیوں نہ کرو' تمہارا بیٹا جو واپس آ رہا ہے' اور میرا بیٹا —— میرا بیٹا ——" سر پر ہاتھ رکھ کر وہ اٹھی' اور اپنے بیٹے کے ماتم کو تازہ کرتی ساری گلی کو چونکاتی چل دی۔

"ارے!" شمشیر نے گلی میں جمع ہوتے ہوئے لوگوں کی طرف دیکھا۔ ان کے چہروں پر غم اور غصّہ کے آثار تھے' اور وہ سب نفرت سے شمشیر کو گھور رہے تھے۔ "ارے!" شمشیر نے دوبارہ کہا' اور سر کو ہاتھوں میں دبا کر وہیں بیٹھ گیا اور بہت دیر تک بیٹھا رہا۔

رات کو چوپال پر لوگ اکٹھے ہوئے تو ذیلدار نے ایٹم بم کا ذکر چھیڑ دیا۔ "اُس کی طاقت پانچ لاکھ ساٹھ ہزار من بارود کے برابر ہوتی ہے۔ جب ہیروشیما پر بم گرا' تو جو لوگ باہر تھے' وہ وہیں دم توڑ گئے اور جو اندر تھے —— وہ مارے حبس کے تڑپ پھڑک کر رہ گئے۔ لاشوں کے چہرے تک نہیں پہچانے جا سکے۔ بم گرا تو سات آٹھ میل اونچا دھوئیں کا مینار ابھر آیا۔ ہیروشیما بالکل مٹ چکا ہے۔ پچاس ہزار سے زیادہ جاپانی مر چکے ہیں۔ ہزاروں ہسپتالوں میں ہیں۔ ہزاروں کا کچھ پتہ ہی نہیں۔ بس اب جنگ کو ختم سمجھو۔"

"ہت تیری نکٹے ناٹے کی۔" ایک دہقان بولا۔ "کیسے گرجتا دھاڑتا بڑھا تھا۔ اور کیسے دبوچا انگریز نے۔"

"نہیں نہیں —— انگریز نہیں۔" اعتراض ہوا۔

"ابے نہیں —— انگریز نے۔"

"امریکہ نے۔"

"انگریز نے۔"

"سارے عالم انسانیت کی بدبختی اور بدطینتی نے۔" پٹواری بولا' اور سب اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔ "جنگ میں زہریلی گیس استعمال کرنا منع ہے' مگر زہریلی گیس سے ہزار درجہ خطرناک ایٹم بم استعمال کرنا جائز ہے۔ بھئی بڑے لچکیلے ہیں جنگی اصول۔ اُس وقت جب ہٹلر نے گیس چھوڑنے کی دھمکی دی تھی تو کانفرنسیں بلائی جانے لگیں' کمیٹیاں ہونے لگیں اور اب —— یہ

ایٹم بم——"

ذیلدار کڑک کر بولا۔ "منشی بکواس بند کرو!"

"میں کہتا ہوں" پٹواری تو جیسے دیوانہ ہو گیا تھا۔ "یہ ایٹم بم کوئی نئی چیز تو نہیں۔ ہم ہندوستانیوں کے لیے ایٹم بم کوئی عجوبہ نہیں۔ بنگال میں کس ایٹم بم نے قحط ڈالا؟ آسام میں کس ایٹم بم نے لڑکیوں کی جوانیاں لوٹیں؟ راجپوتانہ اور پنجاب میں کس ایٹم بم نے بیواؤں اور یتیموں کی فوج کی فوج پیدا کر دی۔ ہندوستان پر تو پچھلی دو صدیوں سے ایٹم بموں کی بارش ہو رہی تھی اور تم منہ کھولے ہیروشیما کے ایٹم بم کی باتیں یوں سن رہے ہو جیسے تمہارے لیے جنّت کا دروازہ کھل گیا—— ایٹم بم کی خبریں تم اخباروں میں کیوں پڑھتے ہو؟ قطب دین سے پوچھو' لال بیگ سے پوچھو' نور خاں سے پوچھو' چچا شمشیر سے پوچھو ——اور——"

"بکواس بند کرو مَیں کہتا ہوں۔" ذیلدار گرجا اور پٹواری تھر تھر کانپتا چوپال پر سے اٹھ کر چلا گیا۔

"منشی پاگل ہو جائے گا۔" ایک شخص نے رائے ظاہر کی۔

مگر ذیلدار کی غضب ناک خاموشی کا تقاضا تھا کہ حاضرین بھی خاموش رہیں۔ کڑی نگاہوں کی گھرکی نے اس اصول توڑنے والے کو کپکپا کر رکھ دیا تھا۔

اب تو نت نئی چٹپٹی خبروں کا تانتا بندھ گیا۔

"برطانیہ میں چھ سال کے بعد سب لوگوں نے صحیح معنوں میں چھٹی منائی' جنگ ختم ہو رہی ہے۔"

"روس نے جاپان کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔"

"موئے کو مارے شاہ مدار—— جنگ ختم ہو جائے گی۔"

"جاپان نے ہتھیار ڈال دیئے۔"

"اللہ بس باقی ہوس—— جنگ ختم ہو گئی۔"

جنگ ختم ہو گئی—— جنگ ختم ہو گئی—— پُتلیاں چمک اٹھیں۔ گالوں پر گلال پھر گئے۔ قیدی اور عدم پتہ بیٹوں کی مائیں لاٹھیاں ٹیکتی گلیوں میں آگئیں۔

"سَچ مُچ؟—— سَچ مُچ"

"ہاں ہاں—— جنگ ختم ہو گئی' جنگ بالکل ختم ہو گئی۔ اب جنگ نہیں ہو گی۔ اب جنگ بالکل نہیں ہو گی۔"

"سَچ مُچ—— سَچ مُچ؟"

اِتنی بڑی سچائی پر ایمان لانے کے لیے بھی تو شیر کا کلیجہ چاہیے۔

"جنگ ختم ہو گئی شاداں بیٹی۔" شمشیر گھر جا کر چلایا' اور شیر کو اٹھا کر اس پر بوسوں کی بوچھاڑ کر دی۔

"سَچ مُچ؟——" مگر شاداں کے اِس استعجاب میں مسرت کے بجائے صرف حیرت تھی۔

"ارے کوئی یقین نہیں کرتا۔ شیر بیٹا' تیرا ابّا اب واپس آ جائے گا۔"

"سچّ!؟" ننھے نے بڑی بڑی گول مول آنکھیں پھاڑ کر دادا کو گھورا ——"تیا لائے دا؟"

"تمہاری سواری کا گھوڑا' عید کے لیے کپڑے اور ٹوپیاں اور بوٹ اور چھڑی اور——"

"پٹاخے؟"

"ہاں ہاں پٹاخے اور پھلجھڑیاں اور——"

"خاک لائے گا۔" شاداں نے بگڑ کر کہا۔

"کیوں؟" جیسے شاداں نے بوڑھے کا منہ نوچ لیا تھا۔

"تنخواہ تو ساری مہاجن ہضم کر گیا۔ وہ تو اپنی جان بچا کر بھی لائے تو

شکر کرو خدا کا۔" اور اس نے نقرئی چوڑیوں کی گھنگھریاں چھنکائیں اور شیر کو گھسیٹ کر اپنے کمرے میں چلی گئی۔

کانٹوں کا وہ گچھا جو دلیر کی قید اور شاداں کی سرد مہری نے اس کے حلق میں ٹھونس رکھا تھا، اچھل کر جیسے اس کے دماغ میں کودنے لگا۔ مگر اب جنگ ختم ہو چکی تھی، اور اندر ہی اندر گھلنے سے یہی بہتر تھا کہ دلیر کی راہ دیکھی جائے۔

دو تین ہفتے بعد اسے معلوم ہوا کہ انگریزوں نے سنگاپور پر دوبارہ قبضہ کر لیا ہے۔ اور پھر آہستہ آہستہ خبریں آنے لگیں کہ قیدیوں کے جہاز ہندوستان آرہے ہیں۔ "دامنِ کوہ کے ایک گاؤں کا نوجوان جو سنگاپور میں جاپان کا قیدی رہا، گھر واپس آچکا ہے۔" اس نے ایک روز ہرکارے کی زبانی سنا، اور اُسی روز ننھی سی بُقچی کاندھے پر لٹکا کر اُسی گاؤں کی راہ لی۔ گاؤں والوں نے بھی اپنے اپنے عزیزوں کے نام اور نمبر لکھ کر دیئے، اور وہ ایک ذمہ دارانہ حیثیت سے، بالکل پرانے بادشاہوں کے ایلچیوں کی طرح پہاڑ کے دامن کی طرف چلا۔

وہاں جا کر اسے نووارد سپاہی کی زبانی معلوم ہوا، کہ قیدی بیشمار تھے اور انہیں مَلایا اور جاوا اور دوسرے جزیروں میں بکھیر دیا گیا تھا اس لیے وہ کوئی یقینی خبر نہیں دے سکتا تھا۔ مایوس ہو کر گھر کو پلٹا۔

تھکا ماندہ کھانستا کھنکارتا جب وہ اپنے گاؤں سے ایک میل کے فاصلے پر پہنچا تو اس نے کچھ دور پٹواری کو اپنی طرف آتے دیکھا۔ دیہاتیوں کا ایک جمگھٹ بہت پرے چپ چاپ کھڑا پٹواری کی طرف دیکھ رہا تھا۔

سورج غروب ہونا چاہتا تھا مگر جیسے شمشیر کے گاؤں میں پہنچ جانے کا منتظر کھڑا تھا۔ دھوپ پیلی پڑ گئی تھی۔ درختوں کے پتے اداس اور نڈھال ہو کر بل کھا گئے تھے۔ کھیتوں پر مُردنی کا عالم تھا۔ ٹھکانوں کو جاتے ہوئے پرندوں کی آوازوں میں شیون تھا۔ پگڈنڈی کے لہراتے ہوئے زرّیں فیتے پر ایک گرد کا دھول میں نہا رہا تھا۔

"واپس آگئے چچا؟" پٹواری نے پوچھا۔

"ہاں ——— واپس آ گیا ہوں ——— نامراد۔" شمشیر نے کہا ——— "مگر تم کہاں چلے؟"

"میں یہاں سے دور جا رہا ہوں، ہمیشہ کے لیے۔"

"کیوں ——— خیریت تو ہے نا؟"

"خیریت؟" پٹواری کے ہونٹوں پر ایک عجیب زہریلی مسکراہٹ نمودار ہوئی اور پھر وہیں چمٹ کر رہ گئی ——— "خیریت امن کی طرح بے معنی لفظ ہے۔ امن کے لفظ سے معنی نچوڑنے کے لیے ماسکو میں مولوٹاف، برنز اور بیون کی کانفرنس ہونے والی ہے اور تمہیں خیریت کا مطلب سمجھانے کے لیے وہ مجمع تمہارا منتظر کھڑا ہے ——— جاؤ بابا ——— تم جو ہر کسی کا مذاق اڑاتے تھے، تم جو بڑی بڑی خبریں سننے کے شوقین تھے، تم جو ہنسنے ہنسانے کے سوا اور کچھ جانتے ہی نہ تھے، جاؤ، وہاں اس مجمع میں دادا شہباز سے پوچھو کہ خیریت کیا چیز ہے۔ اور پھر اپنے گھر جانا، وہاں کہیں طاق پر تمہارے بیٹے کا تار پڑا ہو گا ——— وہ آرہا ہے۔"

"دلیر آرہا ہے؟" شمشیر بُقچی پھینک کر پٹواری سے لپٹ گیا، مگر وہ لوہے کی لاٹھ کی طرح بے حس و حرکت کھڑا رہا اور اسی خوفناک سنجیدگی سے بولا۔ "ہاں واپس آرہا ہے تمہارا دلیر ——— سو تم تار اٹھا کر شیر کو پکارنا، جسے کل صبح اس کی ماں نے دلیر کا تار ملنے کے بعد لاہور کے کسی یتیم خانے کے سفیر کے حوالے کر دیا ہے۔"

"تار ملنے کے بعد؟"

"اور پھر پکارنا۔ شاداں! ——— شاداں بیٹی۔ تمہاری وہ شاداں بیٹی جو شاید ہیروشیما پر ایٹم بم گرائے جانے کی منتظر تھی، جو رات کو تمہارے پڑوسی

دھوبی کے ساتھ بھاگ گئی ہے بنوں کی طرف۔"

"کیا کہہ رہے ہو؟"

"اور پھر تجوری کھول کر وہ روپیہ گننا جو تم نے جنگ کی برکت سے کمایا۔ تمہیں امن اور خیریت کے تمام معانی از بر ہو جائیں گے۔"

وہ شمشیر کے مردہ ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں دبا کر پلٹا اور پگڈنڈی پر ہو لیا۔

سورج دریا کے پرلے کنارے پر پھیلی ہوئی پہاڑیوں میں ڈوب چکا تھا۔ شفق نے پٹواری کے سفید لباس میں آگ سی لگا دی۔ وہ ایک شعلہ سا بن گیا——— دھرتی کے کلیجے سے نکلتا ہوا شعلہ——— رواں دواں——— رواں دواں ——— اور پھر یہ شعلہ بجھنے لگا۔ دھوئیں کا ایک بونا سا بن گیا۔ مشرقی اُفق کی دھند میں گھلتا ہوا یہ سایہ بڑھتا گیا۔ پھیلتا گیا——— ناپید ہوتا گیا——— اور پھر اسی اُفق سے چاند بن کر ابھرا۔ جگمگاتا ہوا، ہنستا ہوا——— جیسے مغرب میں دبکے ہوئے سورج کے تعاقب میں ہے۔

۞

عبدالمتین ایم۔اے

(1)

جو انسان عین عنفوانِ بہار میں اپنی آنکھوں پر پٹی باندھ لے، وہ اوّل تو دیوانہ ہے، اور اگر بفرضِ محال دیوانہ نہیں تو ولی اللہ ہے۔ اس کا ذوقِ دید بہار وخزاں کے امتیاز کا قائل نہیں، وہ اُس حسینۂ فطرت کا پجاری ہے، جس کے اُلوہی دامن میں چاند ستاروں کے علاوہ اماوس کی راتیں بھی ہیں، اور ابنِ آدم کے مقدر کی سیاہی بھی۔

لیکن عبدالمتین نہ تو دیوانہ تھا نہ ولی، تاہم وہ حسینوں کے جھرمٹوں، پھولوں کے ہجوموں اور ساون کے جھالوں سے دور گھر ہی میں پڑے رہنے کا عادی تھا۔ وہ جب ضخیم کتابوں کے انبار میں سے کوئی جلد نکالتا، تو اس کی تھکی تھکی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہو جاتی، اس کے ہونٹوں کی پپڑیاں اچٹ کر ایک دوسرے میں اٹکنے لگتیں، اور اس کی ننھی ننھی مونچھوں کے آس پاس پسینے کے قطرے کہکشاں سی سجا دیتے۔

"دیہات!" وہ پکار اٹھتا——— "بدبخت ہندوستان کے بدنصیب

دیہات' جہاں تہذیبوں نے جنم لیے اور تمدن پروان چڑھے۔ جہاں آدمی نے آدمیت کی عظمت پہچانی' اور جہاں زندگی کو حرکت کا احساس ہوا۔ حسن و جمال کے ان سادہ و معصوم گنواروں کو صدیوں کی غلامی نے چارا کاٹنے والی مشین سے بھی زیادہ ذلیل بنا دیا ہے۔ کوئی آکر ہتھی تھامے اور چکّر گھمائے تو مشین اپنا کام کرے گی' ورنہ پڑی رہے گی اندھیرے کونے میں۔ زنگ چڑھتا رہے گا رنگ اڑتا رہے گا اور مکڑیاں اس کے دہانے پر جالے بُنتی رہیں گی۔"

وہ سوچتا۔ "چارا کاٹنے کی یہ مشینیں اگر چاہیں تو چکّر گھمانے والے کی انگلیوں کو گاجر کی طرح کاٹ کر الگ پھینک دیں' مگر وہ تو ایک ہی ڈھرے پر چلی جا رہی ہیں۔ انہیں اس بات کا احساس ہی نہیں کہ گیہوں اور جَو کے نرم پودے کاٹنے کے علاوہ وہ اپنے آقاؤں کی باہوں کو بھی کہنیوں سے کُتر کر دور پھینک سکتی ہیں۔"

تعلیم سے فارغ ہو کر عبدالمتین نے ہندوستانی دیہات کے متعلق اتنا کچھ پڑھا کہ شہری ہوتے ہوئے بھی وہ دیہاتی ہونے کا دعویٰ کر سکتا تھا۔ اور اکثر اوقات تو اسے یوں محسوس ہوتا تھا' جیسے وہ کسانوں کے ہمراہ زندگی کا ایک ناقابلِ فراموش حصہ گزار آیا ہے۔ اس نے کھیتوں میں ہل چلائے ہیں' فصلوں کی رکھوالی کی ہے' کھلیانوں پر غلے کو گرتے اور بھوسے کو اڑتے دیکھا ہے' شادی بیاہ پر لمبے تڑنگے دہقانوں کے ساتھ گھُمن گھیر ناچ کا لطف اٹھایا ہے اور چراگاہوں کے دور دراز گوشوں میں گنجان درختوں کی چھاؤں تلے لیٹ کر اور بھدی بنسریوں سے تیز سُر نکال کر ہواؤں کو نغموں سے چھلکا دیا ہے۔

عبدالمتین کے والدین اسے انڈین سول سروس یا کم از کم پروونشل سول سروس کا ایک ہر دلعزیز افسر دیکھنا چاہتے تھے' اور عبدالمتین کے ایم۔اے ہو جانے کے بعد انہوں نے اس سلسلہ میں کوششیں بھی شروع کر دی تھیں مگر ایک روز عبدالمتین نے سرکاری ملازمت سے بیزاری کا اظہار کر کے ان کی

امیدوں کے زر فشاں اُفق پر دُھوآں چھٹکا دیا۔ اس کے والد شملہ جانے کی تیاریاں کر رہے تھے' ایک بہت بڑے انگریز افسر سے ان کا دیرینہ اور گہرا یارانہ تھا' اور اس نے عبدالمتین کے فارغ التحصیل ہونے پر گورنر بہادر سے زبردست سفارش کا وعدہ کر رکھا تھا۔ وہ خاندانی خدمات کے سلسلے میں انگریز افسروں کی اسناد جمع کر رہے تھے کہ عبدالمتین سر جھکائے ان کے قریب گیا اور بولا۔

"ابّا جان۔"

انہوں نے پلٹ کر متین کی طرف دیکھا اور کچھ کہنے ہی والے تھے کہ متین کی امّی کی آواز آئی۔

"مل گئی —— یہ پڑی ہے میرے بیاہ کے کپڑوں کے نیچے۔"

"وہاں کیسے جا نکلی!" انہوں نے تعجب سے پوچھا۔

"کیا چیز ابّا جان؟" متین نے سوال کیا۔

"میری خان بہادری کی سند۔"

"کیا ضرورت پڑ گئی اس کی؟"

"شملے جا رہا ہوں نا تمہارے لیے۔"

"مگر جب آپ خان بہادر ہیں تو خان بہادری کی سند کی کیا ضرورت؟"

خان بہادر صاحب بے اختیار ہنس پڑے۔

"تم ہمیشہ تصویر کا ایک ہی رخ دیکھتے ہو بیٹا —— اب دیکھو' تم ایم۔اے ہو' مگر ایم۔اے کی سند دیکھے بغیر تمہیں کوئی شخص ایم۔اے تسلیم نہیں کرے گا۔"

"مجھے تسلیم کرانے کی ضرورت ہی نہیں۔" متین اپنے موضوع کی طرف پلٹ رہا تھا۔ "میں نے ایم۔اے کیا ہے تو اپنے ذہن کی جِلا کی خاطر —— اب میں علم کی روشنی سے اُن بھائیوں کی زندگیاں اُجالوں گا جو عالمِ انسانیت کے

ہر علم کا موضوع ہیں، لیکن جن کو جہل کے اندھیروں نے قرنوں سے جکڑ رکھا ہے ——— میں، ابا جان ——— سرکاری ملازمت کا خواہشمند نہیں ہوں ——— مجھے آپ آزاد چھوڑ دیجئے۔ میں نے اپنے مستقبل کا ایک ایسا پروگرام بنایا ہے، جس پر عمل کر کے میں ہندوستان کی دیہاتی آبادی کو اس کی اہمیت اور عظمت کا احساس دلاؤں گا ——— میں نہیں چاہتا کہ شہروں کے وہ ظالم اجارہ دار جن کے اجداد نے کسانوں کے خون پسینے سے اپنے باغ سینچے ہیں، قیامت تک ان باغوں کے پھولوں اور پھلوں سے فیض یاب ہوتے رہیں۔ میں ان دہقانوں کے نظریئے بدل دوں گا۔ میں ان کی زندگیاں بدل دوں گا۔ میں ان کی نسلوں کے مستقبل بدل دوں گا۔ اس طرح میں، ایک آپ کیا، سارے خاندان کا نام روشن کروں گا۔ آپ شملے کے سفر کو رہنے دیجئے اور میری پیٹھ ٹھونکئے، کہ وہ کام کرنے نکلا ہوں جس کے بغیر نہ ہندوستان آزاد ہو سکتا ہے اور نہ عدل و انصاف کی روح اطمینان کا سانس لے سکتی ہے۔"

"کچھ اور کہنا ہو تو وہ بھی کہہ لو تاکہ تمھیں علمی بدہضمی نہ ہو جائے۔" خان بہادر صاحب نے طنزاً کہا ——— "ختم ہوئی تمہاری تقریر؟"

متین خاموش رہا۔

"کہہ چکے؟" انہوں نے سختی سے پوچھا۔

"جی کہہ چکا۔" متین نے اپنی امی کی طرف دیکھا، جو خان بہادری کی سنہری سند لیے آتشدان کے قریب آ کر رک گئی تھیں۔

"تم نے بھی کچھ سنا؟" خان بہادر صاحب نے اپنی بیگم سے پوچھا۔

اور بھولی بی بی اچانک چھم چھم آنسو برسانے لگیں۔

"میرے نصیب۔" وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولیں اور صوفے میں تقریباً گر گئیں۔

خان بہادر صاحب نے متین کی طرف غضب ناک ہو کر دیکھا اور

بولے۔

"بیٹھ جاؤ۔"

متین کل کی طرح بیٹھ گیا۔ وہ اپنے بلند اور پاکیزہ خیالات کی داد لینے آیا تھا لیکن خان بہادر صاحب کے خیال میں مقررہ اقدار کو یک قلم بدل دینا تو بڑے بڑے انقلابیوں کا کام تھا؛ ایم-اے پاس چھوکروں کے جوشیلے خیالات تو بجلی کے کوندے تھے کہ پل میں چکا چوند اور آن میں گھٹاٹوپ اندھیرا۔ خان بہادر صاحب کو موجودہ دَور کے نوجوانوں کی بے سود غوغا آرائیوں کا علم تھا۔ اس لیے جب انہوں نے اپنے ہونہار فرزند کو بھی اس سیلاب میں بہتا دیکھا تو تڑپ کر رہ گئے۔

"عزیزِ من۔" اب جہاندیدہ خان بہادر صاحب کی تقریر شروع ہوئی۔ "جانتے ہو میں خان بہادر کیسے بنا؟ شاید تم نہیں جانتے کیونکہ کالج کے دنوں میں نوجوان کو ایک لمحے کے لیے بھی یہ خیال نہیں آتا کہ اس کے والدین کتنے کٹھن امتحانوں سے گزر کر اس کی رنگ رلیوں کا سامان مہیا کر رہے ہیں۔ میں نے اوائل عمر میں زمین کا ایک ٹکڑا اونے پونے بیچ کر کچھ روپیہ جمع کیا۔ جب سرکاری افسر گاؤں میں آئے، تو ان کے اعزاز میں بڑی بڑی پارٹیاں دیں۔ میں نے ایک مرتبہ ایک بہت بڑے افسر کی آمد پر گاؤں سے ایک میل پرے ایک سنہری دروازہ کھڑا کیا۔ ایک دفعہ گلیوں میں بناسپتی گھی کے چراغ چلائے۔ ایک بار اپنی زندگی کو خطرے میں ڈال کر پولیس والوں کا ساتھ دیا اور ڈاکوؤں کا ایک گروہ پکڑا۔ غرض میں نے بہت پاپڑ بیلے، کتنی ذلیل خوشامدیں کیں، جب کہیں جا کر خان صاحبی ملی۔ علاقے میں میرا چرچا ہونے لگا۔ ایک کنواں کھدوا کر اس میں دو بڑے بڑے افسروں کے ناموں کے پتھر جڑوا دیئے۔ مدرسے کی عمارت کے ساتھ ایک کمرہ ڈپٹی کمشنر کے نام سے بنوادیا۔ تالاب کو گہرا کھدوا کر فرش کو سیمنٹ سے مضبوط کرایا، تب کہیں جا کر مجھے آنریری مجسٹریٹی ملی، اور ساتھ ہی

خان بہادری کی یہ سند ملی، جسے تم اتنی حقارت سے دیکھ رہے ہو۔ جب میں کچھ زیادہ امیر ہو گیا تو یہاں سے شہر میں گیا کیونکہ دولت کا اصل ٹھکانا شہر ہے، دولت یہیں بڑھتی ہے اور یہیں اس میں حرکت اور برکت پیدا ہوتی ہے۔ یہاں میں نے صدر بازار میں دکانیں خرید لیں، چند مکان تعمیر کرائے۔ ایک ٹھیکہ لے لیا، تمہیں امیر لڑکوں کے اسکول میں داخل کرایا۔ مزید ٹھیکے لیے اور تم کالج میں آ گئے۔ اُور ٹھیکے لیے اور تمہارے ایم۔اے پاس کرنے تک تمہارے لیے اچھا خاصا سرمایہ جمع کر لیا۔

"میرے عزیز! تم بھی کہو گے کہ میں کیا طویل قصّہ لے بیٹھا ہوں، لیکن یہی وہ مقام ہے جہاں قسمت کے ستارے اپنی اصل راہوں کو چھوڑ کر اِدھر اُدھر بھٹکنے پر تل جاتے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ تم اس گروہ میں شامل ہو جاؤ جو تقریریں کرتا ہے، نعروں اور تالیوں کی شراب پی کر متوالا ہو جاتا ہے، لیکن چیتھڑے پہنتا اور ٹکڑے نگلتا ہے۔ جس کو دعویٰ ہوتا ہے آزادی کا، لیکن جو مطمئن غلاموں سے بھی بدتر زندگی بسر کرتا ہے۔ جس کی زندگی اس کے سارے گھرانے کی تباہی کا موجب بنتی ہے، اور جس کا انجام صرف اِس حد تک قابلِ ذکر ہوتا ہے کہ کسی روزانہ اخبار کا کوئی بوڑھا کاتب اخبار کے ایک کونے میں اس کی موت کی خبر چھاپ کر نہایت بے دلی سے ایک کوڑی کی روشنائی سے موٹا سیاہ حاشیہ بنا دیتا ہے۔ لوگ پڑھتے ہیں اور انا للہ کہہ کر کسی اور سرپھرے کی تقریر سننے نکل جاتے ہیں —— سن رہے ہو میری باتیں یا میں یونہی بکے جا رہا ہوں؟"

"جی سن رہا ہوں۔" متین نے ہولے سے کہا۔

"سمجھ بھی رہے ہو نا؟"

"جی سمجھ بھی رہا ہوں۔"

"خاک سمجھ رہے ہو۔"

"سمجھ رہا ہوں جی۔"

"کیا سمجھے؟"

متین نے اپنی امّی طرف دیکھا، اور پھر نظریں جھکا کر بولا۔

"یہی سمجھ رہا ہوں کہ آپ میرا مقصد نہیں سمجھے۔"

خان بہادر صاحب میز پر چٹاخ سے ہاتھ مار کر کھڑے ہو گئے، اور چلّائے —— "متین ——!"

"جانے بھی دیجئے۔" متین کی امّی خان بہادر صاحب کی طرف بڑھیں۔

"تم ماؤں نے نہ جانے کتنے لاڈلوں کو تباہی اور بربادی ——"

باہر کسی نے گھنٹی بجائی۔ خان بہادر صاحب رک گئے۔ متین سنبھل بیٹھا، اور خان بہادر صاحب یہ کہتے باہر چلے گئے۔

"متین! مجھے تم ایسے بیٹے سے ایسی بیہودگی کی امید نہیں تھی۔ سوچ لو شام تک۔ میں کل صبح کی گاڑی سے شملے جا رہا ہوں۔ میری ساری عمر کی محنت پر خاک ڈالنے سے پہلے سوچ لو کہ میں اور تمہاری امّی کیا چاہتے ہیں؟"

"امّی —— آپ کیا چاہتی ہیں؟" خان بہادر صاحب کے چلے جانے کے بعد متین نے پوچھا۔

اور وہ رونے لگیں۔ روتے روتے بچوں کی سی معصوم گھگھی بندھ گئی۔ آنچل سے آنسو پونچھ پونچھ کر آنکھیں سرخ کر لیں؛ متین امّی امّی کی رٹ لگائے رہا، اور جب دیکھا کہ یہ آنسو نہیں تھمنے کے، تو خود بھی رونے لگا۔

ہائے بے چاری ماؤں کے کلیجوں کی نزاکت! اکلوتے بیٹے کی آنکھوں کو بھیگتے دیکھ کر متین کی امّی گھبرا گئیں اور پھر اس گھبراہٹ نے ممتا کی صورت اختیار کر کے متین کی پیٹھ ٹھونکی۔ اسے تسلیاں دیں، اس کے آنسو پونچھے، اور جب شام کے بعد خان بہادر صاحب نے پھر یہی موضوع شروع کیا، تو اپنے

خلاف ایک نیا محاذ دیکھ کر چونکے اور بولے۔

"اچھا تو یہ مشترکہ سازش تھی۔"

لیکن متین کی امّی نے خان بہادر صاحب کے مشتعل جذبات پر کچھ ایسی نرم پھواریں برسائیں کہ وہ بے دلی سے "اچھا بھئی' انگارے نگل لوں گا" کہہ کر بستر پر لیٹ گئے' اور چند لمحوں کے بعد ان کے گونجیلے خرّاٹوں سے متین اور اس کی امّی نے یہی نتیجہ نکالا کہ وہ اپنے فیصلے پر مطمئن ہیں' اور متین کی زندگی کا قافلہ ارادوں کی بھول بھلیاں سے گزر کر عمل کے لالہ زاروں میں داخل ہو چکا ہے۔

(2)

متین نے اس کے بعد مطالعہ میں اَور شدت اختیار کر لی؛ اسے معلوم تھا کہ اِتنے بڑے ملک میں سدھار کی انفرادی کوشش کا کامیاب ہونا غیر ممکن ہے۔ لیکن جب وہ ہندوستان کے سیاسی اور سماجی اداروں کی حالت پر غور کرتا تو اسے یوں محسوس ہوتا کہ اس کے عقیدے زیادہ بلند' زیادہ پاکیزہ اور زیادہ بے لوث ہیں' اور کوئی جماعت اس کے پروگرام کے مطابق مسائلِ حیات کو حل کرنے کا بیڑا نہیں اٹھا سکتی۔ ایک ننھی سی انجمن قائم کرنے کے منصوبے بھی سوچے' اور اپنے اُن ساتھیوں کو خطوط لکھے' جو کالج کے دنوں میں اس کے ہم خیال تھے۔ ہندوستان کے نئے ادب میں زندگی کی نئی نقاشیاں اور نقاب کشائیاں بلکہ نقاب دریاں دیکھ کر تڑپ تڑپ اٹھتے تھے' اور ہوسٹل کے کمروں میں بیٹھ بیٹھ کر کہا کرتے تھے۔

"صرف احساس دلانے کی دیر ہے' صرف یہ ذہن نشین کرانے کی دیر ہے کہ تم غلام ہو' تم ذلیل ہو' تم ملوکیت کے ہاتھوں میں کھلونے ہو۔ واللہ

اگر ہمارے دہقان بھائیوں کے دلوں میں صرف یہ احساس پیدا ہو جائے تو وہ ایک پَل میں پرانی قدروں پر ہل چلا دیں' اور اس میں شرافت' انصاف اور مساوات یعنی صحیح انسانیت کے بیج بو دیں۔"

ان سب ساتھیوں کو اس نے دیہات سدھار کی ایک ہندوستان گیر انجمن قائم کرنے پر اکسایا تھا لیکن وہ یہ دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ اب ان میں کوئی فوجی ٹھیکیدار ہے' کوئی پولیس سب انسپکٹر ہے' کسی نے کپڑے کی دکان کھول لی ہے' کوئی بیمہ کمپنی کا ایجنٹ ہے' ایک صاحب آئی سی ایس کے امتحان کا انتظار کر رہے تھے۔ انہوں نے یہ شرط رکھی تھی کہ اگر وہ کامیاب ہو گئے تو فبہا ورنہ متین کی طرح باغی ہو جائیں گے۔

باغی! متین نے سوچا تھا؛ مجھے بغاوت کی ضرورت نہیں' سدھار اور نکھار کی ضرورت ہے۔ مَیں تو انسانیت کے مَیلے چہرے کی چھائیاں اڑانے نکلا ہوں۔ مجھے تو آدمی کی روح پر تہ بہ تہ جمے ہوئے عقیدوں کو سچائی اور صداقت کے تیزاب سے اکھیڑنا ہے۔ میں تو حقیقی ہندوستان کو یہ جتلانے جا رہا ہوں کہ تم اپنے آپ کو ہندوستانی نہیں کہہ سکتے' تم اپنے آپ کو کسی ملک کا باشندہ نہیں کہہ سکتے' تم خانماں برباد ہو، تم ان کچے گھروندوں کو بھی اپنے گھروندے نہیں کہہ سکتے کیونکہ مہاجن کی لال پوتھی میں ٹیڑھے میڑھے مندرجات کچھ اور کہتے ہیں۔

اُن دنوں متین کو مایوسی نے بیحد پریشان رکھا' لیکن اپنی انفرادیت کو صیقل کرنے کے لیے جلد ہی یورپ کے زندہ فلسفیوں کی کتابیں پڑھنا شروع کر دیں' جنھوں نے اسے بتایا کہ انسان کی انفرادیت بے اندازہ قوتوں کا ایک ہجوم ہے' اور اگر اپنی انفرادیت کو محسوس کرنے والا انسان اجتماعیت کے پہاڑوں سے ٹکرانا چاہے تو بے شک ٹکرائے' کیونکہ خدا کی وحدانیت انسان کی انفرادیت کی پشت پناہی کرتی ہے۔

بے شمار ذہنی ہتھیاروں سے مسلح ہو کر اس نے ایک روز چھوٹا سا بستر باندھا اور روتی ہوئی امّی اور بدحواس ابا کی مضمحل دعائیں لیتا اپنے مقدس سفر پر روانہ ہو گیا۔

"تم انسان ہو متین۔" اپنے ابا کے یہ الفاظ متین کے کانوں میں گونج رہے تھے۔ "تم انسان ہو' اور انسان کائنات کی اشرف مخلوق ہونے کے باوجود بڑا کمینہ' ذلیل' بڑا بدذات ہے۔ چوکس رہیو! سمجھے؟"

(3)

ایک ننھے سے اسٹیشن پر اتر کر اس نے ایک دہقان سے پوچھا۔ "تم کہاں جاؤ گے؟"

"اپنے گاؤں۔" دہقان بیروں کی گٹھڑی میں سوراخ کو اپنی پگڑی سے ایک دھجّی پھاڑ کر بند کرنے میں مصروف تھا۔

"مجھے بھی اپنے ساتھ لے چلو۔" متین نے لجاجت سے کہا۔

دہقان نے پہلے تو اس کی طرف حیرت سے دیکھا۔ پھر قہقہے لگاتا ہوا اٹھا۔ "فوجی بھگوڑے معلوم ہوتے ہو۔" وہ گٹھڑی کو سر پر جماتے ہوئے بولا۔ "کیوں بھئی' میں نے کیا گناہ کیا ہے کہ تمہارے ساتھ حوالات میں پڑا سڑتا رہوں۔" اور وہ گٹھڑی کے سوراخ پر ہاتھ جمائے ایک طرف نکل گیا۔

تمام دہقان اسے انتہا درجہ کے جاہل اور کُڈھب انسان نظر آنے لگے۔ اور وہ ایک ایسی پگڈنڈی پر ہو لیا' جس پر دور تک انسان نظر نہ آتا تھا۔

دوپہر کا وقت تھا۔ کھیتوں کی سبزی سنولا گئی تھی۔ درختوں پر جیسے برسوں کی گرد جم رہی ہو۔ کبھی کبھی چیل کا سایہ پگڈنڈی پر سے گزرتا' تو اسے اپنے بدن میں زندگی کی حرارت محسوس ہوتی' ورنہ وہ بالکل خالی الذہن ہو کر

کسی اَن دیکھی اور غیر معیّن منزل کی طرف پیر گھسیٹے جا رہا تھا۔ گول بستر اس کے شانوں کو ڈس رہا تھا۔ جوتوں کی چرچراہٹ اس کے دماغ پر جھاڑ جھنکاڑ کا ایک انبار بنکر رینگ رہی تھی۔ بہت دور تک جانے کے بعد اس نے بستر کو ایک درخت کے تنے کے قریب پھینک دیا اور دَھپ سے اس پر گر گیا۔

زندگی بڑی کافر محبوبہ ہے' اس نے اپنے خیالوں سے مشورہ کیا۔ یہ بڑی مشکل سے بہلتی ہے اور جب بہل جائے تو پریشانی کی حد تک مہربان ہو جاتی ہے۔ تم اسے بہلا رہے ہو۔ وہ اگر نہیں مَنتی تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ وہ کبھی نہیں مَنے گی۔ نیا نیا جھرنا بھی تو بے شمار موڑ کاٹ کر راہ پیدا کرتا ہے۔ آندھیاں بھی تو اپنے دامنوں کو قیامت خیز تیزی سے پھڑپھڑا کر چلتی ہیں۔ پہاڑ کی چوٹی بھی تو عجیب و غریب زاویئے بنا کر ابھرتی ہے۔ خطِ مستقیم کا تو اس دنیا میں گزر ہی نہیں۔ سیدھے مینار پر چڑھنے کے لیے بھی چکراتی ہوئی سیڑھیوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ عزم کی کامیابی اِس کی شدت میں ہے۔ وہ محض جی بہلاوے کی خاطر اس گتھّی کو سلجھانے لگا؛ مگر اچانک کسی چیز نے اس کی گردن پر اِس شدّت سے کاٹا کہ فلسفہ دھرا رہ گیا۔ ہڑبڑا کر اٹھا تو اسے اپنے جسم پر عجیب الخلقت کیڑے رینگتے نظر آئے جو درخت کے تنے پر ایک ٹیڑھی سی راہ بناتے اس کے بستر سے چمٹ گئے تھے۔

امّی کی تیار کردہ مٹھائی سے اُسے گِھن سی آنے لگی۔ آخر ایک سیّاح کو' ایک مُصلح کو' ایک صحرانورد کو مٹھائیوں سے کیا کام۔ مامتا بہت بھولی ہوتی ہے۔ بڑی مشکل سے اس نے لباس صاف کیا۔ بستر جھاڑا اور اجڑی پگڈنڈی پر چل دیا۔

ابھی وہ تھوڑی ہی دور گیا ہو گا کہ ایک معمولی سا کتّا اس پر جھپٹا اور اِس زور سے غرّانے اور بھونکنے لگا' جیسے اس نے دو ٹانگوں پر کھڑے ہوئے اس قسم کے جانور کو ساری عمر میں پہلی مرتبہ دیکھا ہے۔ وہ چلّاتا رہا۔ "ارے ہٹ'

ارے دُور ہو، دھت دھت" اور پھر زبان اور تالو کے اتصال سے پٹاخے چلائے، مگر دیہاتی کتّوں کی سیاست ہی الگ ہوتی ہے۔ مغلوب ہو جاؤ تو خیر، ورنہ میلوں تک ساتھ دیں گے۔

"ارے بیٹھ جاؤ۔" ایک طرف سے آواز آئی۔

متین فوراً بیٹھ گیا، اور کتّا دُم ہلاتا ایک بیروٹے کی طرف پلٹ گیا۔

بیروٹے کے لاغر تنے کا سہارا لیے ایک بوڑھا کسان بھیڑوں کی اون بَٹ رہا تھا۔ پاس ایک جھجّھر پڑی تھی۔ اور اوپر ٹہنی سے نسواری کپڑے میں بندھی ہوئی کوئی چیز لٹک رہی تھی۔

"کدھر جانا ہے جوان؟" بوڑھے نے آواز دی۔

متین سے کوئی جواب نہ بن آیا۔ فوجی بھگوڑے کی پھبتی نے اس کے پروگرام کے ابتدائی لطیف حصّے کو کُتر ڈالا تھا۔ وہیں بیٹھے بیٹھے گلے کی رگوں کو مَلا اور بستر کے نیچے سے ایک کنکر نکال کر بولا۔

"بابا ذرا کتّے کو روکو، مجھے تم سے بہت سی باتیں کرنا ہیں۔"

"مجھ سے؟" بوڑھا اون کے گولے کو زمین پر رکھ کر اٹھا ——

"کہاں سے آئے ہو؟ ——" اور اس نے کتّے کو پرے دھتکار دیا —— "آ جاؤ —— پہلے ہی بتا دیا ہوتا۔ بیگو نے تو نہیں بھیجا تجھے؟"

متین بستر اٹھا کر کسان کے پاس آ گیا۔

"بیگو —— بیگو کون ہے؟" اس نے بستر کو جھجّھر کے قریب رکھ کر اس پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔

"بیگو میرا بیٹا ہے۔" بوڑھا تنے کے سہارے بیٹھ گیا —— "لاہور میں رہتا ہے۔ پولیس میں سپاہی ہے۔ اُس کا نمبر ——"

متین بوڑھے کو بہت دیر تک تاریکی میں نہیں رکھنا چاہتا تھا۔ "مَیں ایک مسافر ہوں بابا۔ مجھے یہیں کہیں کسی ایک گاؤں میں جانا ہے؛ مَیں بیگو کو

نہیں جانتا۔"

بوڑھے کا چہرہ یوں کملا گیا۔ جیسے ربر کے غبارے میں کانٹا چبھ جائے۔

"کس گاؤں جانا ہے؟"

"کسی گاؤں میں۔"

"کون ہو تم؟"

"مَیں تم غریب کسانوں کا؟ ——"

"غریب کسان!" بوڑھے نے رنگ بدلا —— "کون غریب —— اللہ کا فضل ہے۔ رسولؐ کا کرم ہے۔ گھر ہے۔ زمینیں ہیں۔ خود پنشن پاتا ہوں۔ ایک بیٹا سپاہی ہے۔ دوسرا ایسا جوان ہے کہ پھریری آ جاتی ہے دیکھنے والے کو تمہیں کس نے بتایا ہے کہ مَیں غریب ہوں؟"

متین کا تیر نشانے سے چُوک گیا تھا۔ ایک نئے خیال نے اسے سنبھالا دیا۔ "میرا مطلب ہے تم سادہ کسانوں کا ——"

"سادہ؟" بوڑھا تقریباً پریشان ہو گیا —— "سادہ یعنی بیوقوف —— جانتے ہو جوان، میں نے ضلع کچہری میں کتنی بار بڑے بڑے بیرشٹروں کے منہ میں گھنگھنیوں کی مُٹھی ڈال دی تھی۔ تھانیدار کو کوئی دفعہ بھول جائے تو مجھ سے پوچھتا ہے۔ عمر بھر مقدمہ بازی کی ہے۔ تم اپنے ہوش میں تو ہو؟ اور یہ گٹھڑی میں کیا باندھ رکھا ہے؟ چیونٹیاں چڑھ رہی ہیں۔"

متین نے بستر کو جھاڑا اور مسکرا کر اسے کھولتے ہوئے بولا۔ "بڑا تنگ کیا ہے کیڑوں مکوڑوں نے۔ جہاں بیٹھتا ہوں وہیں آ دھمکتے ہیں۔"

"یہ تو کیڑوں کی عادت ہے۔" بوڑھے نے مٹھائی کی جھلک پا کر کہا۔

"جہاں مٹھائی ہو گی وہاں کیڑا ضرور آئے گا۔ بڑے لفنگے ہوتے ہیں یہ۔ دور دور سے کِھچے چلے آتے ہیں۔ ایسا لگتا ہے جیسے مٹھاس نے انہیں پکار لیا ہے کہ آؤ بھئی مکوڑو ہم آ گئے۔"

بوڑھا زور زور سے ہنسنے لگا اور متین نے اس کا ساتھ دیا۔ بے ریا ہنسی نے تکلف کے پردوں کی دھجیاں اڑا دیں۔ ہنسی ختم ہونے کے بعد بوڑھے نے آنکھیں پونچھیں اور جھجھر پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔

"پانی پیو گے؟"

"پانی تو پیوں گا بابا مگر ایک مشکل حل کر دو تو عمر بھر کا احسان کرو گے۔"

متین کے لہجے میں لجاجت نے چکناہٹ پیدا کر دی تھی —— "اصل میں بات یہ ہے کہ مَیں نے ان دیہات کی گندی رسموں اور واہیات رواجوں کے بارے میں بہت باتیں سنی ہیں۔ ویسے ایک رئیس کا بیٹا ہوں، مگر تم بھائیوں کو بھونڈے رواجوں میں پھنسے دیکھ کر مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ گھر بار چھوڑ، امیری پر لات مار، صرف یہ بستر اٹھائے ہوئے اِدھر آ نکلا ہوں کہ تمہارے کسی کام آ سکوں!"

"وعظ کر لیتے ہو؟"

متین نے بوڑھے کو مایوس کرنا مناسب نہ سمجھا۔

"کچھ کر ہی لیتا ہوں؛ چاہتا ہوں تم لوگ فضول رسموں کے شکنجوں سے نکل کر اپنے آپ کو پہچانو اور ——"

"اپنے آپ کو پہچانو!" بوڑھے نے جیسے اپنے آپ سے مشورہ کیا۔

"عجیب بات ہے! کون نہیں پہچانتا اپنے آپ کو۔"

جگہ جگہ پر اس نوع کے ذہنی جھٹکے کھا کر متین ڈھیٹ ہو چلا تھا۔ وہ بڑی رد و کد اور ہیر پھیر کے بعد بوڑھے دہقان کو یہ یقین دلانے میں کامیاب ہو گیا کہ اس کا مقصد نیک ہے اور اپنے آپ کو دیہات کی بہبود کے لیے وقف کر دینے سے اس نے ایک عدیم المثال قربانی دی ہے۔ بوڑھا باہر شہروں میں ملازم رہ چکا تھا اس لیے چند رواجوں کی بدنمائی اسے بھی چبھتی تھی۔ اور پھر متین کے

نرم اور استدعا کرتے ہوئے لہجے سے وہ کچھ متاثر ہو گیا تھا۔ متین کو اپنے ہاں ٹھہرانے پر رضامند ہو گیا اور یہ بھی وعدہ کیا کہ وہ دوسرے دہقانوں کو بھی متین کے مشن کے متعلق سب کچھ سمجھا دے گا اور گاؤں والے اس کے ساتھ تعاون کریں گے۔ اس لئے کہ "ذیلدار کے بعد مَیں ہی مَیں ہوں گاؤں میں اللہ کے فضل سے۔" بوڑھے نے ڈھیرنی گھماتے ہوئے کہا تھا۔

شام تک متین وہیں بیٹھا رہا۔ بوڑھا کبھی کبھی اٹھ کر کھیتوں کا چکر لگا آتا۔ واپس آ کر اُون بٹتا۔ متین سے انگریز کی نئی نئی ایجادوں کے بارے میں سوال کرتا۔ اٹھ کر ایک اور لمبا چکر کاٹ آتا۔ پلٹ کر متین کے کہنے پر مٹھائی کے چند دانے اٹھا کر کھاتا۔ خالص اور نقلی گھی کے متعلق بڑے پتے کی باتیں کرتا اور پھر کھیتوں کی طرف چلا جاتا۔ ڈبو اب متین سے ہِل گیا تھا۔ مٹھائی کھا کر اس نے دُم بھی ہلا دی تھی اور متین کے پچکارنے پر یوں بڑبڑایا تھا، جیسے کہہ رہا ہو۔

"بڑا مزا اُس ملاپ میں ہے جو صلح ہو جائے جنگ ہو کر۔"

سورج غروب ہونے سے قبل بوڑھے نے گاؤں جانے کی تیاری کی۔ جھجھر کی رسّی میں بازو ڈال کر اسے کاندھے پر لٹکایا اور اُون کا گولا ہاتھ میں لیے ڈھیرنی کو گھماتا ہوا بولا۔

"چل بھئی گاؤں چلیں۔ بوڑھا ہوں ورنہ تیرا بستر اٹھا لیتا۔ آج ہی چوپال پر لے جاؤں گا تجھے۔ مَلک سے تیری ملاقات ہو گئی تو میری ضرورت بھی نہیں رہے گی۔ بڑا سمجھدار آدمی ہے۔ سرکاری سندوں کا پلندہ اٹھائے پھرتا ہے۔"

سفر جاری ہو چکا تھا۔ ڈھیرنی گھوم رہی تھی۔ جھجھر چھلک رہی تھی اور اُودے آسمان پر ڈوبتے ہوئے سورج نے زعفران سا بکھیر دیا تھا۔ درختوں سے جھکا ہوا اُفق سمٹا آ رہا تھا اور پگڈنڈی غیر معمولی طور پر واضح ہو گئی تھی۔ چڑیوں کے غول ہواؤں میں ڈُبکیاں لگاتے سیاہی مائل زردی میں ڈوبے جا رہے تھے۔

ایک چڑیا پگڈنڈی سے کچھ دور ایک خشک درخت پر بیٹھی چہچہا رہی تھی۔

"دلفنگی معلوم ہوتی ہے یہ چڑیا۔" بوڑھا مسکرایا۔ "کسی لفنگے کی راہ دیکھ رہی ہے، جبھی تو غول سے کٹ گئی ہے۔"

متین ہنسا تو بوڑھا بولا۔

"یہ لالچ کمبخت ہر چیز سے لگا ہوا ہے۔ مرغا مرغی کے پیچھے دوڑا پھر رہا ہے۔ کبوتری کبوتر کو بلا رہی ہے، گدھا گدھی کے پیچھے مارا مارا پھرتا ہے۔ پچھلے دنوں ہمارے گاؤں کی چھوکری —— بیاہی چھوکری ایک پردیسی لفنگے کے ساتھ بھاگ گئی۔ قدرت کے کھیل ہیں۔"

متین کو اسکول کے ابتدائی درجوں کی ایک کتاب کا نام یاد آگیا۔ قدرت کے کھیل یا عملی جغرافیہ —— لیکن متین اس قسم کے عملی جغرافیہ کو اپنے پروگرام کے لیے زہرِ قاتل سمجھتا تھا اور وہ نر اور مادہ کے تعلقات سے اس درجہ متنفر تھا کہ وارث شاہ کی "ہیر" پڑھ کر اس نے ایک کتاب لکھنے کا تہیہ کر لیا تھا جس میں وہ رانجھا کو ایک ایسے آوارہ گرد لونڈے کی صورت میں پیش کرنا چاہتا تھا جو محض جنسی حظ کی خاطر ایک خاندانی لڑکی کی سُبکی پر تل گیا اور اپنے ساتھ اُس نادان کو بھی لے مرا۔ اس نے سوچا تھا کہ اس قسم کے قصّے نوجوانوں کے لیے دعوت نامے ہیں۔ آخر وارث شاہ ایسے بزرگ کو کیا ضرورت پڑی تھی کہ دنیا جہاں کے علوم حاصل کر کے انہیں عشق کے ایک قصّے میں ٹھونس دیا۔ اس کے بجائے وہ فقہ کا ایک رسالچہ لکھ جاتا تو بات بھی تھی۔

بوڑھا جس کی داڑھی میں گنتی کے سیاہ بال باقی رہ گئے تھے، اور جس کی ناک پر بھی جھرّیاں پڑ رہی تھیں، کس مزے سے چڑیا چڑے اور مرغا مرغی کی باتیں کر رہا ہے۔ رسموں کے شکار ہونے کے علاوہ ان جاہلوں کے اخلاق کتنے خراب ہیں۔

"مَیں رنگون کی پولیس میں سپاہی تھا۔" بوڑھا اپنی دُھن میں ڈھیرن

ھماتا باتیں کرتا جا رہا تھا —— "ایک روز میں نے سمندر کے کنارے ایک ڑکی کو دیکھا —— چچ چچ چچ —— کیا پوچھتے ہو متین میاں —— کریلے کی یل سے نازک، اتنے لمبے بال کہ چاہے تو کپڑے اتار کر بالوں میں چھپ جائے۔ اتھے پر ایک پیلی سی ٹکیا، جیسے چودھویں کا ابھرتا ہوا چاند۔ ہونٹ اِتنے سرخ کے چیل تازہ گوشت کے دھوکے میں جھپٹ پڑے۔ ریت پر ٹہلتی کتاب پڑھ رہی تھی۔ قدم اٹھاتی تھی تو جیسے سانپ نے پھن اٹھایا ہے۔ سمندر موج میں آتا تھا تو جیسے اِسی سے لپٹنے آ رہا ہے۔ میں پاس سے گذرا تو میری طرف دیکھا س نے —— چچ چچ چچ متین میاں، کیا پوچھتے ہو۔ بھرے بھرے گوشت میں کلا چبھ جائے تو کیا ہوتا ہے؟ —— غرررررچ کی آواز آتی ہے نا —— اُس ی نظروں نے میرے دل پر تکلے کا سا کام کیا اور مَیں نے اپنے سینے میں دل کے کٹنے کی آواز بھی سنی، مگر متین میاں بات یہ ہے کہ مَیں سپاہی تھا اور پردیسی تھا ور اُس وقت مجھے ایک افسر کے پاس پہنچنا تھا۔

"خیر —— تو رات کو میری ڈیوٹی لگی شہر سے باہر ایک سڑک پر —— اندھیرا تھا۔ میری جیب میں چور بتی تھی۔ مَیں ایک کھمبے سے ٹیک لگا کر ھڑا تھا کہ قریب ہی کھسر پھسر سی ہوئی۔ آواز کا پیچھا کیا۔ دبے پاؤں ایک رخت کے پاس پہنچا۔ چور بتی جلائی —— اور متین میاں —— کیا پوچھتے ہو —— اب کیا بتاؤں۔ وہی لڑکی ایک کالے کلوٹے برمی لفنگے کے ساتھ —— ڑک کے کنارے —— شہر کے پاس —— چچ چچ چچ —— انسان اتنا اچھا وتے ہوئے بھی کتنا کمینہ، کتنا ذلیل، کتنا بدذات ہے —— خیر، تو مجھے دیکھ کر ونوں گھبرا گئے۔ میں نے سپاہیوں کی سی انگریزی میں کہا —— "گو آن۔ گو ن۔ آل رائٹ۔ کوائٹ آل رائٹ۔ آئی ناٹ فیل —— آئی گلیڈ۔ گو آن —— " اور انہیں چھیڑے بغیر پلٹ آیا۔ اصل میں مجھے اس لڑکی پر رحم آگیا ٹانا —— ایسا لگتا تھا کہ میں نے عمر بھر میں صرف یہی ثواب کا کام کیا ہے

—— پر مَیں سوچتا ہوں، مدتوں سوچتا رہا کہ اگر اُس روز سمندر کے کنارے مَیں ہی اُسے —— یعنی اگر وہ ایسی ہی تھی تو مَیں ہی اُسے —— اے ڈبّو!"
بوڑھا چونکا اور ایک راہ چلتے پر جھپٹتے ہوئے ڈبّو کو پکارا۔ "واپس آ جا کمبخت، باولا ہوا پھرتا ہے۔ لالہ مُرلی دھر کی بکری کو ایک بار کیا کاٹا، اب ساری دنیا کو بکری سمجھ لیا ہے تو نے۔ کبھی کسی کی لٹھ پڑی تو چیں بول جائے گی، آن میں۔ اِتنا کَس ہے تو سُرخے سے الجھ، وہاں تو تیری دُم مبارک پیٹ سے سِل جاتی ہے —— لفنگے لوٹ آ۔"

ڈبّو لوٹ آیا اور بوڑھے نے قصّے کا ٹوٹا ہوا تار جوڑا۔ "یعنی اگر میں ہی اسے سمندر کے کنارے ——" مگر اب گاؤں نزدیک آ گیا تھا۔ قدم قدم پر السلام علیکم سے واسطہ پڑنے لگا۔ بوڑھے نے "پھر سناؤں گا" کا لالچ دے کر متین کو تسلّی دی —— جی ہاں، تسلّی، کیونکہ متین اس قصّے کے ادھورے پن سے جانے اداس کیوں ہو گیا تھا۔

"بابا جی" ایک شخص قریب سے گزرتے ہوئے بولا۔ "گھر سے ہو کر سیدھے چوپال پر پہنچو۔ ایک بھکاری چھوکرا آیا ہے کہیں سے۔ یوں گاتا ہے جیسے پیتل کی پرات میں روپے گر رہے ہوں۔"

"چچ چچ چچ" بابا حاجی بولا۔ "کیا کہنے تیرے فتح نور۔ خدا کی قسم، جب ملتا ہے جب کوئی چٹپٹی سنا دیتا ہے۔ قسم ہے اگر تو اخبار ہوتا تو تجھے ساری د پڑھتی۔"

زور زور کے قہقہے رکے تو متین بولا۔

"تم حاجی ہو بابا؟"

"میرا نام حاجی احمد ہے۔" وہ بولا۔ "حج کی ہم میں کیا توفیق —— سوچ رہا ہوں بیگو حوالدار ہو جائے، اعظم بھرتی ہو جائے، کچھ پونجی جمع کر لیں اپنے رسولؐ ——"

اور اس نے اپنے ہاتھوں کے انگوٹھوں کو جوڑ کر چوما۔ انہیں آنکھوں پر ماتھے پر لگایا —— "میرا سب کچھ قربان ہو جائے ان پر —— ان کے پاک روضے کی زیارت کروں۔ پر ایسے نصیب کہاں مجھ گنہگار کے ——" یہاں بابا حاجی کی آواز بھرّا گئی اور اس نے اندھیرے میں ڈھیرنی کو پوری شدت سے گھما کر آنسوؤں سے سیلی ہوئی آواز میں کہا۔ "ایسی قسمت کہاں مجھ ——" (اور یہاں اس نے اپنے آپ کو ہولناک گالی دی) —— ایسے نصیب کہاں۔"

متین موضوعِ گفتگو کی اس پھریری سے چکرا گیا۔ رنگون کی چھوکریوں کے لذت ناک ذکر کے بعد اچانک مذہبی خلوص کا یہ بے لوث مظاہرہ! متین کو دیہاتیوں کے کرداروں میں اِس قسم کے تضاد کے متعلق کتابوں نے کچھ نہیں بتایا تھا۔ مگر وہ ایک طرح مطمئن بھی تھا کہ اسے نئے تجربات حاصل ہو رہے تھے۔ اگرچہ اس نئے تجربے کو ابھی تک اس کے دماغ میں سما کر بس جانے کی گنجائش نہیں ملی تھی۔

بوڑھے حاجی کا گھر گاؤں کے سرے پر تھا۔ تنگ اور بے ڈھب موڑوں سے بھرپور بدبو دار گلیوں میں وہ حاجی کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ ہر موڑ پر اسے ایک گھُورا نظر آیا، اور تقریباً ہر گھُورے پر ایک گدھا، جو کوڑے کے ڈھیروں میں مولی اور شلغم کے پتّوں اور دیگر نعمتوں کی تلاش میں مصروف تھا۔ ہر گھر کے دروازے پر ایک بھونڈا کتّا بھونک رہا تھا اور ہر کتّے کے آس پاس غلیظ بچوں کا ایک ہجوم تھا جو کتّے کو بجائے روکنے کے ہُشکار رہے تھے۔ "ہٹ تمہارے دُمیں لگاؤں لفنگو" بوڑھا حاجی شریر بچوں پر برستا اور بچے بھاگ جاتے۔

"ہسپتال آیا ہے۔" ایک بچہ للکارا۔

"لڑکوں نے تمہیں ڈاکٹر سمجھا ہے۔" بوڑھے نے بچے کی ترجمانی کی۔

"ٹیکا —— ارے ٹیکا۔" ایک اور شریر چہکا۔

"لڑکوں نے تمہیں ویکسینیٹر سمجھا ہے۔"

"آہا راجہ رسالو۔" میراسیوں کی چھت پر سے آواز آئی۔

"ہت الف لیلہ کے بچے۔" بوڑھے نے کالے کلوٹے میراسی کو دھتکارا۔ اور پھر پلٹ کو بولا۔ "مجھے شیطان کا ایک فیصلہ بہت پسند ہے۔ کہتے ہیں کہ وہ بچوں سے پناہ مانگتا ہے۔ ہر جاندار کو اِن لفنگوں سے پناہ مانگنی چاہئے۔ ابھی پچھلے دنوں ایک نیا نیا ماسٹر آیا ہمارے مدرسے میں۔ چوپال پر بیٹھا مُلک سے باتیں کر رہا تھا اور ازار بند لٹک رہا تھا اس کا۔ ایک لڑکا سب کی آنکھ بچا کر چارپائی کے نیچے گھس گیا اور ازار بند کے سرے سے ایک مرا ہوا چوہا باندھ کر کھسک گیا لفنگا۔"

"ٹھیک ہے۔" متین نے کہنے کے بجائے سوچنا بہتر سمجھا۔ بچوں کے متعلق مَیں نے کتابوں میں پڑھا ہے کہ بہت شریر ہوتے ہیں، لیکن شرارت کوئی جبلّی صفت نہیں، اِکتسابی ہے؛ اور ان دیہاتی لونڈوں کو اکتساب کا موقع ہی کہاں میسر آتا ہے جن کی دنیا گھر گلی، کھیت کھلیان کا ایک اٹوٹ دائرہ ہے؛ اور ایک بچوں ہی کی کیا، یہی دنیا دیہات کے جوانوں اور بوڑھوں کی بھی ہے۔ بوڑھا رنگون تک گھوم آیا ہے اس لیے مزے کی باتیں کر رہا ہے۔ یہ کھیت کی مینڈ اور پانی کی راہ اور جھاڑی کی شاخ پر اُلجھ کر کٹ مرنے والے لوگ زندگی کا اتنا وسیع نظریہ کہاں سے سیکھ سکتے ہیں، جن کے چار طرف فطرت ایک عریاں ناچ میں مگن ہے۔ لیکن جو شاعر نہیں بن سکتے (بابا حاجی کے رنگون کے قصّے نے متین کی متانت کھنگال دی تھی) جن کی نعشوں پر پولیس اور انگریزی سرکار کے دیگر بیشمار محکموں کے کارندے دعوتیں اڑاتے ہیں، مگر یہ آواز تک بلند نہیں کر سکتے؛ جن کی گلیوں کے چپے چپے پر کوڑے کرکٹ کے متعفّن ڈھیر پڑے ہیں لیکن یہ نہیں جانتے کہ وہ مکھیوں کی پرورش کر رہے ہیں، جو ہیضے کا باعث بنتی ہیں——کاش وہ اپنے ساتھ میجک لینٹر کا سامان اور مکھی اور مچھر کی

بارگزاریوں کی چند سلائڈز لے آتا۔

"مداری" کسی چھوکرے نے خوشی سے تالی بجائی اور ہجولیوں کے ہجوم میں گھس گیا۔

اور بوڑھا حاجی ہنس کر بولا۔

"نئی بات ہے نا، اس لیے شرارت کرتے ہیں لفنگے۔ چند دنوں میں گھل مل جائیں گے۔"

(4)

ایک چنگھاڑتے ہوئے "کھڑکے" کو کھول کر حاجی پکارا:

"اعظم۔"

اُدھر سے ایک کراری آواز آئی۔

"آیا بابا۔"

"ارے آنے والے کی ضرورت نہیں۔" حاجی نے متین کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ "سرخے کو قابو میں رکھو۔ میرے ساتھ ایک مہمان ہے۔"

سامنے دیوار کے ایک سوراخ میں پڑے ہوئے دِیئے کی پیلی اداس روشنی میں ایک عورت کا بھوسلا سر ابھرا۔

"بسم اللہ۔ بسم اللہ۔"

"ارے آ جائیں ہم؟" حاجی پکارا۔

اندھیرے کونے سے اعظم کی آواز آئی۔

"آ جاؤ بابا——میں کب کا سرخے پر سوار ہوں۔"

"زنجیر سے باندھ دو۔" حاجی نے حکم دیا اور دونوں آگے بڑھے۔

حاجی بولا۔ "یہ شہر سے آئے ہیں۔ وعظ کرتے ہیں؛ پڑھے لکھے، کہا۔تے

پیتے ہیں ——— اعظم اِدھر آؤ۔"

"بسم اللہ ——— بسم اللہ۔" بڑھیا نے چادر کو ماتھے تک کھینچ لیا۔

ایک نوخیز جوان نے نہایت ادب سے مصافحہ کیا۔ اس کے ہاتھوں میں گرمی تھی اور اس گرمی میں احترام تھا اور اس احترام میں خلوص تھا اور اس خلوص میں سادگی تھی۔

سُرخا برابر بھَونکے جا رہا تھا۔

ایک پلنگ باہر نکالا گیا جو شاید مہینوں سے اندر پڑا تھا کیونکہ اس کے رنگین پایوں پر گرد تھی اور اس پر بچھی ہوئی موٹی سی چادر کو نہایت احتیاط سے دور سرخے کے پاس جھاڑا گیا۔ ایک لمبا سا تکیہ بھی جھاڑا گیا۔ اعظم کھانڈ کا شربت گھول لایا۔ کھانا مونگ کی دال اور گھی لگی روٹی پر مشتمل تھا۔

جب چوپال پر جانے کی تیاریاں ہونے لگیں تو بڑھیا بولی۔

"بیٹے تو گرم دودھ پیئے گا کہ ٹھنڈا؟"

"میں دودھ نہیں پیوں گا۔" متین مدارات کی شدت سے گھبرا گیا تھا۔

بابا حاجی ہنسنے لگا۔

"دودھ تو پینا ہی پڑے گا میاں۔ ہمارے ہاں تو جو مہمان انکار کرے اسے لٹا کر انڈیل دیا جاتا ہے دودھ اس کے منہ میں۔ دودھ نہ پیو گے تو جیو گے کیسے؟ اور اس لفنگے سُرخے کو کیا ہو گیا ہے آج، بکے جا رہا ہے۔"

"پیوں گا۔" متین نے مسکرا کر کہا۔ اور حاجی، اعظم کے ساتھ کھڑکے کی طرف جانے لگا۔

"گرم کہ ٹھنڈا؟" بڑھیا دِیئے کے قریب سے پکاری۔

"گرم۔"

"گرم؟" حاجی پھر ہنسنے لگا۔ "جوان ہو کر گرم دودھ پیتے ہو؟ کبھی دودھ کا مزا بھی چکھا ہے؟"

"ٹھنڈا سہی۔" متین مسکرایا۔ بوڑھا کھنکار کر آگے بڑھا اور بڑھیا غضبناک سرخے کے آگے کھانا ڈالتے ہوئے بولی۔

"کتنا بھولا ہے اللہ رکھے۔"

(5)

چوپال کی اہمیت کا اسے پورا احساس تھا اور دیہات کی سماجی زندگی کے اِس ہمہ گیر اور ہمہ مرکز کو دیکھنے، اس کے مختلف شعبوں میں حصہ لینے، اس کا گہرا مطالعہ کر کے اس کے نقائص دور کرنے کا تہیّہ اس کی نئی زندگی کا پہلا مرحلہ تھا۔ چوپال کی پہلی سیڑھی پر قدم رکھتے ہی اس کا دماغ اُپلوں کے گاڑھے اور بدبودار دھوئیں سے چکرا گیا۔

"یہ دھوآں کیسا ہے؟" اس نے اعظم سے پوچھا۔

"حقّے کے لیے بار بار آگ کی ضرورت پڑتی ہے نا۔" اعظم نے جواب دیا۔ ناک پر رومال رکھتے ہوئے اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ چار طرف بچھی ہوئی پتھروں کی چوڑی سِلوں پر چند دہقان بیٹھے تھے۔ کچھ نیم دراز تھے ——— چند پگڑیوں کو کہنیوں تلے دھرے حقّے کے کش لگا رہے تھے۔ وسط میں دو کھاٹیں پڑی تھیں جن پر ذیلدار اور اس کے رشتہ دار طُرّوں کے جھنڈے بلند کیے مصنوعی انداز میں کھنکار رہے تھے۔ فرش پر کمیّں بیٹھے تھے اور کونے میں اُپلے دھواں چھوڑ رہے تھے۔ حاجی اور اعظم کے چوپال پر قدم رکھتے ہی لوگ منتظر انداز میں خاموش ہو گئے۔ ذیلدار نے حاجی کے سلام کا جواب نہایت محبت سے دیا اور چند دہقانوں نے اٹھ کر حاجی کو بیٹھنے کے لیے جگہ پیش کی۔ ذیلدار بولا ——— "سنا ہے آج تمہارے ہاں کوئی واعظ آئے ہیں؟"

متین آگے بڑھا اور ذیلدار سے مؤدبانہ مصافحہ کر کے کھاٹ کے ایک

کونے پر بیٹھ گیا اور بولا۔

"مَیں واعظ تو نہیں ہوں صاحب' کیونکہ واعظ کا مفہوم مذہب سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا اور مَیں مذہب کے بارے کچھ نہیں جانتا۔"

"ذرا اِدھر ہو بیٹھو۔" ذیلدار نے بطور تواضع کہا۔ "ادوائن پر بیٹھنے والے اور تھوڑے ہیں؟ ہاں نام کیا ہے تمہارا؟"

"عبدالمتین۔"

"مسلمان؟"

"مسلمان۔"

"مسلمان ہو کر اپنے مذہب کے متعلق کچھ نہیں جانتے؟"

"جانتا ہوں کچھ نہ کچھ —— لیکن اِتنا نہیں کہ واعظ کہلا سکوں۔"

"تو پھر تم کیا ہو؟"

"مجھے بس اپنا ایک خادم سمجھ لیجئے۔"

ذیلدار یہ عجیب سا جواب سن کر کچھ دیر خاموش رہا۔ سوچ کر بولا۔

"میرے پاس تو کوئی جگہ نہیں۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ تمہیں ملازمت کی بھی ضرورت ہے۔ سائیس البتہ بیمار ہے' پر اس کا کام اس کا بیٹا کر لیتا ہے۔"

متین گھبرا کر مسکرانے لگا اور ہنستا ہوا حاجی اس کی کمک کو پہنچا۔

"زبان کچھ ایسی ہی ہے ان کی کہ دھوکا ہو جاتا ہے؛ مجھے بھی غلطی لگی تھی۔ اصل میں یہ ہمارے گاؤں میں آئے ہیں' ہمارے یہاں کی بُری رسمیں دور کرنے' یہ تو بہت امیر آدمی ہیں۔"

ماحول کو معتدل دیکھ کر متین نے اپنے دل کا سارا غبار اُگل دینا چاہا۔

"ایک اِس گاؤں پر کیا موقوف ہے' جب تک میں زندہ ہوں ہندوستان کے گاؤں گاؤں کے چکر لگاؤں گا اور وہاں کے بھائیوں کو بتاؤں گا کہ دنیا بہت وسیع ہے مگر تم بھوکے بیل کی طرح اپنے کھیت کھلیان ہی کو ساری دنیا سمجھ بیٹھے ہو۔

تمہارے جسم میں فولاد کا سا جسّ اور تمہاری روح میں فرشتوں کا سا کَس بل ہے مگر تمہیں اس کا احساس نہیں۔ تم یہ نہیں جانتے کہ جو روپیہ تم مقدموں پر' قرضے پر' لڑکے لڑکی کے بیاہ پر پانی کی طرح بہا دیتے ہو' وہ نئی قسم کے ہلوں اور ٹریکٹروں پر صرف کیا جا سکتا ہے جس سے تمہاری فصلیں دوگنا غلّہ پیدا کر سکیں۔ تم یہ نہیں جانتے کہ تمہارے نمبردار اور ذیلدار اور تھانیدار —— سب تمہارے خدمت گزار ہیں۔ تمہیں ان سے خائف نہیں رہنا چاہیے کیونکہ وہ تمہاری خدمت پر مامور ہیں۔ حق تو یہ ہے کہ وہ تمہاری ذرا سی شکایت سے اپنے آپ کو بہت بڑا مجرم سمجھنے لگیں —— مَیں ——"

"چھوکرا کہاں ہے؟" ذیلدار نے اچانک آستین سے دشنہ نکالا۔ "پہلے اس کا گانا سن لیں۔ پھر یہ باتیں بھی ہوتی رہیں گی۔ مبارک ہیں تمہارے ارادے۔ اللہ برکت دے۔ ہاں تو کہاں ہے چھوکرا؟"

متین کی بات کاٹ کر ذیلدار نے متین کی وہی حالت کر دی تھی' جو دہکتے ہوئے کوئلوں کی پانی کے بھرپور چھینٹے سے ہوتی ہے۔ اندر ہی اندر شُوک پُھنکار کر رہ گیا۔ اب گرد و پیش سے کھسر پھسر شروع ہو چکی تھی۔ ایک چھوکرا جو دراصل نوجوان تھا مگر محض غریبی کے باعث چھوکرا تھا' ایک طرف سے اٹھ کر آیا' زمین پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا اور اِکتارے کے ایک سِرے کو گود میں جما کر "تنن" سے تار کو چھیڑا۔ لیٹے ہوئے لوگ اٹھ بیٹھے' اور اٹھے ہوئے لوگ آگے جھک آئے۔ ذیلدار نے کہنی بدلی۔ بابا حاجی نے "چچ چچ چچ" سے تأثرات کی نقاب کشائی کی۔ اعظم نے حقہ الگ رکھ دیا۔ اُپلوں کے بوجھل دھوئیں میں عطر سا رچ گیا۔ اور ہولے ہولے چلتی ہوئی ہوا تھم کر جیسے چوپال کے صحن پر خیمے کی طرح تن گئی۔ "تنن" چھوکرے نے تار کو ایک مرتبہ پھر چھوا' اور ذیلدار نے تنن کی ختم ہوتی ہوئی نون کے آخری نقطے سے آواز بلند کی "بھئی بہت سنے اِکتارے' پر اس اِکتارے کا تو تار بھی گاتا ہے۔ ذرا غور سے

سنو تو جیسے یہ تار کچھ کہہ رہا ہے' کچھ الاپ رہا ہے۔ ہاں چھوکرے پہلے ذرا اِکتارا بجاؤ' صرف اکتارا۔"

"پری کے بالوں کے تار معلوم ہوتے ہیں۔" بابا حاجی بولا۔

"ہائے۔" ہجوم میں سے کسی نے سانسوں کا ایک ڈھیر اگل ڈالا۔

اب بھونڈے اکتارے سے نغموں کی ایک دھارا اُمڈ پڑی۔ چھوکرے کی انگلیوں نے کچھ ایسا آہنگ پیدا کیا اور یہ آہنگ مختلف اتار چڑھاؤ طے کرتا جب عروج کے آخری نقطے پر پہنچا اور چھوکرے کی انگلیوں میں کوئی غیر مرئی قوت حُلول کر گئی اور اس کا سر نغموں کے تال پر ڈولنے لگا تو ذیلدار سے ضبط نہ ہو سکا۔

"ٹھہرو چھوکرے' ٹھہرو' یہی بہت ہے' یہی بہت ہے۔"

چھوکرے کی انگلیاں رک گئیں اور آسمان پر جیسے بہت سے ستارے ایک ساتھ ٹوٹ کر آسمان کو دھندلا گئے۔ اِکتارا ڈھیلا پڑ کر چھوکرے کے شانے سے ٹک گیا اور دہقانوں نے انگڑائیاں لیتے ہوئے اسے داد دی۔ حاجی نے کہا۔ "ساری تھکان دور ہو گئی۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے جوڑ جوڑ کو کسی نے تھپکا کر سُلا دیا ہے۔ ارے ایسا بلا کا ہنر ہے تیرے پاس اور تُو بھیک مانگتا پھرتا ہے چھوکرے —— چچ چچ چچ۔"

"یہی تو مصیبت ہے۔" متین نے موقعہ سے فائدہ اٹھایا۔ "اب اگر یہی لڑکا کسی شہر میں ہوتا تو کسی فلم کمپنی یا کسی تھیٹر یا ریڈیو میں' یہ ہر مہینے سینکڑوں روپے کماتا۔ بھکاری اس کے پاس آتے۔ بڑی بڑی محفلوں میں اسے عزّت کی جگہ دی جاتی۔ یہ کتنا بڑا ظلم ہے کہ یہ ایسا ہنرور ہوتے ہوئے یہاں خاک پر بیٹھا ہے۔ اور ہم اس کے مقابلے میں بالکل نکمے ہوتے ہوئے بھی پلنگوں پر ڈٹے ہوئے ہیں۔ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ وجہ صرف یہ ہے کہ ہم اچھی بری چیز میں امتیاز نہیں کر سکتے' اور امتیاز کرتے ہیں تو قدر نہیں جانتے۔ ہم سب

چھوکرے کا کمال مان رہے ہیں مگر اس کا نتیجہ کیا ہے! بس یہی کہ تم میں سے کوئی صاحب اس کے ہاتھ میں دوّنی چوّنی تھما کر ——"

"بات یہ ہے عبدالمتین جی" ذیلدار نے آستین میں سے دوسرا دشنہ نکالا۔ "بات یہ ہے کہ یہ باتیں تو پھر ہو لیں گی —— لگے ہاتھوں چھوکرے سے کوئی گانا وانا بھی سن لیں۔ آپ یہیں رہیں گے نا چند روز۔"

"چند روز!" متین نے کہا۔ "جب تک میں یہاں کی فضا کو ٹھیک نہیں کر لیتا یہاں سے قطعی نہیں ٹلوں گا۔"

آس پاس سے چند نوجوانوں کی رکی رکی' دبی دبی ہنسی کی آواز پر متین چونکا۔ بابا حاجی جو عزّتِ نفس کے معاملے میں آگ بگولا اور لال بھبوکا ہو ہو جاتا تھا تڑپ اٹھا۔

"کون ہنستا ہے بھئی —— یہ کس کے پیٹ میں اینٹھن ہوئی ہے؟ متین میاں سارے گاؤں کے مہمان ہیں۔ یہ تم کو لوٹنے ورغلانے نہیں آئے' سیدھے راستے پر لگانے آئے ہیں اور تم ہنستے ہو؟ میں سچ کہتا ہوں اگر کسی نے ان سے دل لگی کی جرأت کی تو میں ——"

اور اعظم نے گرج کر فقرہ پورا کر دیا۔ "مَیں اس کی زبان گُدّی سے کھینچ لوں گا۔"

چھوکرا کھسک کر دیوار سے لگ گیا۔ ذیلدار نے چارپائی سے ٹانگیں لٹکا دیں۔ اور بولا۔

"کس نے تمہارے مہمان کو بُرا کہا ہے چچا؟ ہم سب کے دلوں میں ان کی عزّت ہے۔ مجال ہے کسی کی کہ ان سے کوئی الٹی سیدھی بات کرے۔ بیوقوف لڑکے ہیں' کل پرسوں تک سمجھ جائیں گے۔ اور ہاں' وہ گانا تو بیچ ہی میں دھرا رہ گیا۔ اور بھئی تم کہاں کھسک گئے۔ آگے آؤ۔ اِکتارے کا کمال دیکھا' اب ذرا گلے ——"

چھوکرا شاید پہلے سے تیار بیٹھا تھا۔ کان پر ہاتھ دھر کر اُس نے ایک بلند اور لمبی تان میں ہوائی دوہے کی ابتداء کی۔ یہ تان اپنی بے شمار متناسب دھڑکنوں کے ساتھ ایک مسلسل خطِ مستقیم بناتی فضا میں بڑھتی اور پھیلتی چلی گئی۔ اور پھر اچانک ایک مہین سا خم کھا کر والہانہ انداز میں ڈولنے لگی۔ ڈولتے ڈولتے جیسے نشیبوں میں اتر گئی' اور وہیں گہری کھاڑیوں اور اندھیری گپھاؤں میں پھڑ پھڑا کر کھو گئی۔ (اِکتارے کے ماتمی سُروں نے آواز کی اس ٹوٹی ہوئی لڑی پر پھول برسائے۔ اور پھر اچانک نشیبوں کے اِس مزار سے ایک گھومتا چکراتا ہوا دوہا بلند ہُوا :

کِہی انوکھڑی چال سجن دی جِیویں ناگن کُنڈلی مارے
یا اِک بانکا مور ٹہلدا اپنے کھَنب سنوارے
یا اَسمان تے دَھمّی ویلے کنبھدے ٹُٹدے تارے
یا ساون دی گوری بدلی جو وَسدیاں چِر چا لاوے

(میرے ساجن کی چال کیسی انوکھی ہے' جیسے ناگن کُنڈل مار رہی ہے' یا ایک بانکا مور ٹہلتے ہوئے اپنے پر سنوار رہا ہے' یا گجرِدَم آسمان پر ستارے کانپ اور ٹوٹ رہے ہیں' یا وہ ساون کی ایک گوری بدلی ہے جو برسنے میں دیر لگا دے اور آسمان پر آہستہ خرامی سے منڈلاتی رہے!)

اور متین نے سوچا کہ یہی وہ فاسد خیالات ہیں جن کا قلع قمع کرنے کے لیے وہ اِن دور دراز بستیوں میں آیا ہے۔ یہی وہ ادب ہے جس نے ہمارے نوجوانوں کے ذہنوں پر خماروں کے خول چڑھا رکھے ہیں۔ اور پھر نہ جانے یہ کیا مصیبت ہے کہ شہروں میں ریڈیو کھولو تو:

"ساجن تجھ بن رَین اندھیری"

قصبوں میں گراموفون ریکارڈ لگاؤ تو:

"مورے چھیل چھبیلے سَجنوا"

اور اِس دور افتادہ گاؤں میں' جہاں نہ شہریوں کی سی فراخ دل تہذیب ہے' نہ مال کی سی کھلی سڑکیں ہیں' نہ لارنس کے سے باغات ہیں اور نہ عورتیں کھلے بندوں آرائش و زیبائش کی نمائش کرتی پھرتی ہیں' سجن کا یہ تصور یہاں کیسے آنکلا! ـــــ ساجن' ساجن' ساجن ـــــ اور یہ گھُورے کا تعفّن' اور یہ گلیوں میں کالے پانی کے گڑھے' اور یہ اندھیرے کوٹھے جن کے ایک کونے میں مویشی گوبر کی ڈھیریاں ڈھال رہے ہیں اور دوسرے کونے میں عورت بچہ جَن رہی ہے' نہ روشندان' نہ کھڑکی' نہ میڈیکل ایڈ!

دوہے کے بعد کی اختتامی الاپ ابھی جاری تھی اور متین نے سوچا۔ ویسے یہ ناگن اور مور اور تارے اور بدلی کی خوش خرامیاں ہیں کتنی معقول۔ نہ جانے ان دہقانیوں کا خیال تاروں اور بدلیوں تک کیسے پہنچ جاتا ہے' اور واقعی اگر کسی کی ایسی ہی چال ہو ـــــ تو ـــــ!

"بڑا اچھا دوہا ہے بھئی۔ چال کے بارے میں کوئی اور دوہا بھی یاد ہے تمہیں؟" چھوکرے نے اپنے قدردان کی طرف دیکھا' جیسے کہہ رہا ہو: "تم ہماری دلچسپیوں میں حصہ لے رہے ہو، اس لیے تم ہمارے قریب آ رہے ہو۔ اب تم ہم میں سے ہو۔" چھوکرے نے ایک اور دوہا الاپا:

دیکھ کے تارے ٹُٹ ٹُٹ جاون کِہی سوہنیاں تیریاں چالاں
پتلی ٹہنی پئی جھُولا جھُولے مَیں اُس نوں کِنجیں سنبھالاں
قدم قدم تے بجلی لِسکے ایہہ بھانبڑ دِل وچ بالاں
دنیا ساری چکّر کھاوے جِویں کھُوہ دیاں نویاں ماہلاں

(تیری چال کتنی حسین ہے۔ اِتنی حسین کہ تجھے دیکھ کر ستارے مارے شرم کے ٹوٹ ٹوٹ جاتے ہیں۔ پتلی ٹہنی ہلکورے کھا رہی ہے' مَیں اسے کیسے سنبھالوں (مجھے خوف ہے کہیں ٹوٹ نہ جائے) قدم قدم پر کوندا لپک جاتا ہے' اور جی چاہتا ہے ان شعلوں کو اپنے دل میں روشن کروں۔ تیری چال کے اثر سے ساری

دنیا یوں چکرا رہی ہے جیسے کنوئیں کی نئی ماہل (جس کے تسلسل میں آہنگ ہوتا ہے۔)

پھر وہی تارے اور نازک ٹہنی اور کوندے اور کنویں کی نئی ماہل! پھر وہی چھوڑی ہوئی ہڈیاں —— مگر کتنی حسین اور دلآویز باتیں ہیں۔ اور سچ مچ کیا ایسی چال بھی ہوتی ہے کسی کی؟ نہیں ہوتی، نہیں ہو سکتی۔ یہ محض تخیّل ہے، اور تخیّل عمل کا دشمن ہے اور میں عمل کے لیے یہاں آیا ہوں ——
"آہنگ" اُس نے کھنکار کر اپنے جسم پر سے تخیّل کی اوس جھاڑ دی، اور عبدالمتین ایم۔اے بن بیٹھا۔

دوہے کے ختم ہوتے ہی دیہاتیوں نے ایک واویلا کے ساتھ چھوکرے پر تحسین و آفرین کے دونگڑے برسا دیئے۔ بابا حاجی کی آواز سب سے بلند تھی۔

"کسی کے گلے میں نور ہوتا ہے، کسی کے گلے میں آگ ہوتی ہے، پر چھوکرے! تیرے گلے میں جنّت ہے، نور بھی اور سرور بھی اور خوشبو بھی، سب کچھ۔ خدا مجھے شرک سے بچائے، پر سچ کہتا ہوں، سچ کہنا شرک نہیں، کہ نماز پڑھتے وقت مجھے خدا اتنا یاد نہیں آیا جتنا اس وقت۔"

"کیا کہنے ہیں" ذیلدار نے جیب سے پانچ روپے کا نوٹ نکال کر چھوکرے کی طرف پھینکا۔ "تو کہاں کا رہنے والا ہے بے؟"

اور چھوکرے نے ذیلدار اور پھر بابا حاجی کے نوٹوں کو نیفے میں اُڑس کر عجیب سی آواز میں جواب دیا۔ اِس آواز میں لجاجت بھی تھی اور بے پروائی بھی۔ جیسے وہ بھکاری بھی ہے اور شہنشاہ بھی —— بولا —— "جہاں رات آلے وہیں ہمارا گھر ہے۔ ساری دنیا ہمارا گھر ہے۔ اس آسمان تلے خدا نے جتنے میدان اور پہاڑ بکھیر رکھے ہیں، وہ سب ہمارے ہیں —— ہمارے تمہارے سب کے۔"

"اب کہاں سے آ رہے ہو؟"

"پُورب سے آ رہا ہوں، پچھّم جانا ہے۔"

"اُتریا دکھّن کیوں نہیں چلے جاتے؟"

"سورج پورب سے ابھرتا ہے، پچھّم میں چھپتا ہے۔ ہمارے 'بابا کہا کرتے تھے، سورج کا یہ روز کا آنا جانا بے فائدہ نہیں۔ یہ اشارہ ہے خدا کا کہ چلو، اے وہ لوگو جن کا وطن ساری دنیا ہے، اور جن کے گھر کی چھت آسمان ہے، اور بستر ندی کنارے کی ریت اور گھاٹی کا سبزہ ہے، پورب سے چلو اور پچھّم پر چڑھ دوڑو، اور پچھّم کی گپھاؤں میں راستہ کھو بیٹھو، تو نراس نہ ہو، بلکہ ان گپھاؤں میں گھومتے رہو کیونکہ جو پچھّم میں چھپا وہ پورب سے سورج بن کر ابھرا۔"

"بات سمجھ میں نہیں آئی تمہاری۔" دراصل ذیلدار لطف لے رہا تھا۔

"اور پھر ملک صاحب جی۔ سنگیت کی دیوی نے بھی تو پورب سے پچھّم کا سفر کیا تھا۔ بنگال میں اس نے جنم لیا۔ گنگا جمنا کے کناروں پر جوان ہوئی۔ پنجاب میں اس کی جوانی ڈھلنی شروع ہوئی، اور افغانوں میں جا کر وہ بڑھاپے کی وجہ سے راستہ کھو بیٹھی۔"

"بس آگے نہ گئی؟"

"وہ بنگال سے پچھّم کی طرف چلی اور پچھّم کی گپھاؤں میں راستہ کھو بیٹھی اور پھر ایران سے سورج بن کر ابھری، بچپنے اور جوانی اور اَدھیڑ عمر کے دور کو ختم کر کے آخر اس نے ہمارے حاکموں کے دیس میں دم توڑ دیا۔"

"ہمارے حاکموں کے دیس میں؟"

"جی ہاں ملک صاحب جی۔ ہمارے حاکموں کے دیس میں سنگیت کی دیوی کو موت آئی۔"

"اس کے بعد؟"

"اس کے بعد کی بات تو وہی جانے جی، جس نے سورج کو پورب سے اُبھارا اور پچھم میں چُھپایا۔ پر بُجھنے نہ دیا بلکہ پُورب سے پھر اُبھار دیا۔ کون جانے سنگیت کی دیوی بنگال کے رمنوں سے پھر سورج بن کر ابھر آئے۔"

"تم لکھے پڑھے معلوم ہوتے ہو۔"

"ہم پڑھے لکھے نہیں صاحب جی۔ ہم تو بس اِتنا جانتے ہیں کہ دل زندہ ہو تو جگ بھر میں زندگی ہی زندگی ہے، اور دل مردہ ہو تو جگ بھر میں مُردنی ہی مُردنی ہے۔ ہمارے دل زندہ ہیں کیونکہ ہم گاتے ہیں اور گانا کبھی نہیں مرتا اور اس لیے گانے والا کبھی نہیں مرتا، اور اسی لیے سنگیت کی دیوی ولایت سے غوطہ لگا کر بنگال کے رمنوں سے سورج بن کر ابھرے گی۔"

نہ جانے ذیلدار نے اس چھوکرے سے اور کیا کیا بے معنی سوال پوچھے اور اس نے کیا الجھے الجھے جواب دیئے۔ مگر متینؔ ان سوالات سے بے پروا سوچتا رہا کہ یہ اُجڈپنے کی حد نہیں تو کیا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں گا نہیں سکتا، میرے پاس اِکتارا بھی نہیں، اور مجھے ایسی فضول گپیں ہانکنا بھی نہیں آتیں مگر کیا یہ بدبخت میری باتوں کے افادی پہلو کی طرف بالکل متوجہ نہیں ہو سکیں گے۔ اپنے بھلے کی باتوں کی طرف ان کا ذہن منتقل نہیں ہوتا، مگر ناگن کی کنڈلیوں اور ساجن کی چالوں سے انہیں وہ حظ حاصل ہوا ہے کہ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے سارے کے سارے شراب کے نشے میں دُھت ہیں —— ان حیوانوں کو راہِ راست پر لانا تو پتھر میں سے پانی نکالنا ہے۔

"متین میاں۔" بابا حاجی نے مداخلت کی۔ "کیسا رہا گانا؟"

"اچھا ہے۔" متین نے دیہاتیوں کو خوش کرنے کے لیے ریاکاری سے کام لینا چاہا، اور داد کے مشہور جملے دہرا دیئے۔ "خوب ہے، کیا کہنے، سبحان اللہ! ——" اپنے مِشن کی دُھن اس کے دماغ پر اس شدت سے سوار تھی کہ وہ

داد دیتے ہوئے مجبور ہو کر بولا۔ "مگر دنیا میں صرف گانا ہی تو سب کچھ نہیں بابا جی —— اور باتیں بھی تو ہیں —— !"

"جن کا اپنا وقت مقرر ہے۔" ذیلدار نے برجستہ کہا۔

"ہم دن بھر کے تھکے ماندے اگر اِس وقت بھی کھیت کھلیان کی باتیں لے بیٹھیں تو جی چکے ہم۔" بابا حاجی نے کہا۔

متین سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ دراصل اس کا خیال تھا کہ چوپال پر قدم رکھتے ہی وہ گاؤں بھر کو چونکا دے گا۔ گاؤں کے مشرق سے مغرب تک تعجب اور حیرت کی ایک رَو دوڑتی چلی جائے گی اور چوپال کے ارد گرد بچے کھڑے ہو جائیں گے اور چھتوں پر عورتوں کے ٹھٹ لگ جائیں گی اور دہقان مارے ادب کے اس کے سامنے بیٹھ تک نہ سکیں گے اور ذیلدار پائنتی کی طرف بیٹھ کر غور سے اس کی باتیں سنے گا۔ اور "جی۔جی" کا تانتا باندھ دے گا۔ مگر یہ عجیب گاؤں ہے۔ آتے ہی اصطبل کی سائیسی سپرد ہونے لگی۔ بات کرتا ہوں تو تڑاق سے جواب ملتا ہے۔ لوگ ہنس رہے ہیں اور ابھی ابھی ایک کمیّن نے اس کی پنڈلی کو نہایت سختی سے پکڑ کر کمال بے ادبی سے کہا۔ "اِدھر میرا جوتا تھا میاں ——" جیسے میں جوتوں کا چور ہوں۔

مگر اس کا نشہ ایسا معمولی نہ تھا کہ ذرا سی ترشی سے اتر جاتا۔ موقع اور حالات کا اندازہ لگا کر اس نے نہایت نرمی سے کہا۔

"مَیں شہری ہوں ملک جی، اور دیہات میں پہلی بار آیا ہوں۔ آپ شاید میری باتوں پر یقین نہ کریں لیکن میرا دل ہی جانتا ہے کہ میرے اندر دیہاتی بھائیوں کے سدھار کا جذبہ کتنا شدید ہے۔ میں نے بہت تجویزیں سوچ رکھی ہیں۔ وہ سب آپ کے آگے پیش کر دوں گا۔ آپ نے انہیں پسند کیا تو میں ایک خادم کی طرح کام شروع کردوں گا اور آپ دیکھیں گے کہ ایک ہی برس، بلکہ ایک ہی مہینے میں یہ ننھا منا گاؤں علاقے بھر میں کتنی اہم حیثیت اختیار کر

جاتا ہے۔ اگر آپ منظور کریں تو کل صبح سویرے چوپال پر گاؤں جمع ہو جائے۔"

"صبح کو تو لوگ باہر کھیتوں میں چلے جاتے ہیں۔"

"دوپہر کو۔"

"دوپہر کو گرمی ہوتی ہے اِن دنوں۔"

"شام کے بعد سہی۔" بابا حاجی نے اپنے مہمان کا ہاتھ بٹایا۔

"شام کے بعد سہی۔" ذیلدار نے کہا——اور پھر میراسی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "دیکھو میرو، اِسی وقت جا کر ڈھول اٹھا اور مغربی محلّے تک چلا جا۔ ڈھنڈورا پیٹ دے کہ کل شام کے بعد سارا گاؤں چوپال پر جمع ہو جائے۔ گاؤں کے بھلے کی خاطر ایک صاحب کچھ تجویزیں لائے ہیں۔"

میراسی فوراً چلا گیا اور ذیلدار نے رسماً متین کی امداد کا وعدہ کر کے انگڑائی لی یعنی اعلان کیا کہ چوپال پر سے اٹھ جاؤ، ہمیں نیند آئی ہے۔

(6)

بابا حاجی کے مکان سے متصل ایک ننھی سی چوپال تھی جس کے ایک سرے پر ایک چھوٹی سی کوٹھڑی تھی۔ اس کا ایک دروازہ چوپال پر اور دوسرا گلی میں کھلتا تھا۔ یہ چوپال جس کے چار طرف بچھی ہوئی پتھر کی بڑی بڑی سلیں گرد آلود تھیں، بابا کی برادری نے تعمیر کرائی تھی مگر جب سنہ چودہ کی لام میں بابا حاجی کے سب بھائی فرانس کے میدانوں میں سلطنتِ برطانیہ پر سورج چمکائے رکھنے کی کوشش میں مارے گئے تو اس چوپال پر سے سورج ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا۔ کوٹھڑی میں بھوسہ ڈال دیا گیا تھا اور چوپال پر بچے بنٹے کھیلتے تھے یا جھیوروں کے تھکے ماندے گدھے کوٹھڑی کے سائے میں مراقبہ کرتے،

گدھیوں سے رومان لڑاتے اور لید کی شطرنج بچھا کر چلے جاتے۔

صبح سویرے اعظم نے کوٹھڑی سے بھوسہ نکلوایا، دیواروں پر کپڑا پھیرا، فرش پر ریت بچھا کر اس پر چھڑکاؤ کیا، چھت پر سے تنکوں بھرے جالے اتارے، چوپال کے صحن کو صاف کرایا اور پتھر کی سلوں کو گیلے چیتھڑوں سے دھو ڈالا۔ سامنے گلی میں بھی چھڑکاؤ کر دیا گیا اور متین کے لیے رنگین پایوں والا پلنگ کوٹھڑی میں بچھا دیا گیا۔ پڑوس کے پنشنر صوبیدار کے ہاں سے ایک میز اور ایک کرسی مانگ لی گئی۔ ایک کونے میں دو ٹھنڈے گھڑے جما دیئے گئے۔ دیواروں میں میخیں گاڑ دی گئیں اور متین کی رہائش کے لیے ایک نہایت آرام دہ جگہ تیار ہو گئی۔

کھانے کے لیے جب وہ بے ہنگم کھڑکے کو عبور کر کے چولھانے کی طرف بڑھا تو کونے میں بندھے ہوئے سرخے نے قیامت مچا دی۔ اعظم اور بڑھیا اور بابا حاجی نے اسے خاموش کرانے کی ہزار کوشش کی، مگر بے سود! تنگ آ کر اعظم نے اندر سے ایک چھڑی نکالی اور سرخے پر بارش کر دی۔ ڈبو متین کی ٹانگوں میں گھس گیا۔ مگر سرخا درد کے احساس سے بے پروا متین پر جھپٹتا تھا اور گلے میں بندھی ہوئی زنجیر کے زور سے قلابازی کھا کر پھر بھونکنے لگتا تھا۔

"عجیب کتّا ہے!" متین نے سہمے ہوئے لہجے میں کہا۔

"پہلے اِتنا غصہ اِس نے کبھی نہیں دکھایا۔" اعظم نے کہا۔

"جانے آج کیا ہو گیا اِس لفنگے کو۔" بابا حاجی نے چولھانے کے کونے میں متین کے پاس پلنگ پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

کھانے سے فارغ ہو کر بابا حاجی نے متین سے باہر جانے کی اجازت چاہی اور اعظم کو متین کی خاطر مدارات کی تاکید کرتا رخصت ہو گیا۔

اعظم اٹھارہ اُنیس برس کا خوبصورت سرخ رُو نوجوان تھا۔ اس کے پٹے کانوں کے قریب گچھوں کی طرح لٹکتے رہتے تھے اور اس کے بھرے بھرے

سڈول جسم کو ڈھیلے ڈھالے لباس نے نہایت البیلا بنا دیا تھا۔ تھوڑی سی دیر میں متین نے اعظم سے دوستی پیدا کر لی تھی۔ اعظم اردو کی چھ جماعتیں پاس تھا۔ اقبال' گاندھی' جناح' سکندر حیات اور سہگل کے نام جانتا تھا اور اسے یہ بھی معلوم تھا کہ شاہدرہ میں آصف الدولہ کے مقبرے کا گنبد فنِ تعمیر کا ایک بے مثل نمونہ ہے۔

"یہ فضول باتیں ہیں۔" متین اسے اپنا نائب بنانے پر تُل گیا تھا۔ "یہ کتابوں کی باتیں ہیں۔ تجربے کا اَور معاملہ ہے۔ بھونڈا سا گنبد ہے -- گول مٹول سا۔ عام گنبدوں ایسا۔ ہر طرف کبوتروں کی بیٹیں ہیں' اور پلستر اکھڑا ہوا ہے' اور اینٹیں نظر آ رہی ہیں۔ کوئی خاص بات نہیں اس میں۔ اصل میں ان لوگوں کو وقت کاٹنے کے لیے اور کوئی بات نہ سوجھے تو ایسی ہی بے معنی باتوں پر اتر آتے ہیں۔ کوئی پوچھے تم آثارِ قدیمہ کے پیچھے کیوں پڑ گئے ہو۔ انسانیت کے ان کھنڈروں کی طرف کیوں متوجہ نہیں ہوتے جو دیہات میں قدم قدم پر بکھرے پڑے ہیں۔ لاہور میں راوی کی سیر کو لوگ بڑی نعمت سمجھتے ہیں۔ تم نے شاید لاہور نہیں دیکھا۔ ایک ننھی سی دھار بہہ رہی ہے لاہور کے قریب۔ بالشت بھر کا پاٹ ہے اور گز بھر کا پل ہے۔ نیچے بھونڈی کشتیاں کھڑی ہیں۔ حالانکہ انسان چاہے تو پائنچے اوپر اٹھا کر گزر جائے۔ گھٹنوں گھٹنوں تو پانی ہے۔ اِسی راوی کے متعلق شاعروں نے نظمیں کہی ہیں' اور مصوّروں نے تصویریں بنائی ہیں' اور کانگریس نے اِسی کے کنارے آزادیِ ہند کا اعلان کیا تھا۔ یہ تو اعظم بھائی ڈھکوسلے ہیں۔ محل کی بُرجیوں اور کنگوروں اور محرابوں کی ہر کوئی تعریف کرے گا۔ خواہ مخواہ بغیر سوچے سمجھے' محض تقلید کے جنون میں —— یہ کوئی نہیں سوچے گا کہ آخر بنیاد کیسی ہے' جس پر یہ محل اتنی مدت سے کھڑا ہے —— بنیاد' بنیاد' بنیاد —— بنیاد کو سمجھو' بنیاد کو مضبوط کرو —— میرا یہی نعرہ ہے۔"

"ٹھیک ہے۔" اعظم نے کہا۔ "ہمارے ایک شاعر نے کہا ہے:

مُڈھ نوں نپیئے کوئی اِتبار نہ پانڈاں دا

(درختوں کے تنے کو تھامنا چاہیے کیونکہ پُھننگوں کا (ان کی نزاکت کے مدِنظر) کوئی اعتبار نہیں۔)

"یہ ہے سچّی شاعری" متین نے سعدی اور حالی کے بعد تیسرے شاعر کی تعریف کی تھی۔ یہی وہ شاعری ہے جس نے مردہ قوموں میں زندگی کی روح پھونکی اور زندہ قوموں کے دلوں میں ہمیشہ زندہ رہنے کی لگن پیدا کی۔ اگر کل رات گویّا چھوکرا یہی گیت گاتا تو کتنا اچھا رہتا۔ محبوب کی چال اور ناگن کی کُنڈلیاں اور ستارے اور بدلیاں —— یہ آنی جانی چیزیں ہیں' اِن پُھننگوں کا کیا اعتبار۔ بقا تنے کو ہے۔ کچھ اَور بھی یاد ہے؟"

"جی ہاں" اعظم نے جواب دیا۔ "بہت کچھ یاد ہے۔ ہمارے وطن میں جو گانا چلتا ہے۔ اسے "ماہیا" کہتے ہیں؛ آپ جہاں چلے جائیں' آپ کے کان میں کسی نہ کسی وقت ماہیا کی بِھنک ضرور پڑے گی۔ ٹپّا اور دوہڑہ اور بولی اور ڈھولا' یہ سب ماہیا کی باندیاں ہیں' اور ماہیا رانی ہے گیتوں کی۔ یہ بڑا اچھوتا گیت ہے۔ اب یہی کلی جو میں نے آپ کے سامنے پڑھی ہے، آپ کو کتنی اچھی لگی ہے حالانکہ آپ کا خیال پاک ہے؛ کون جانے مولوی اس کا کیا مطلب نکالیں گے۔ جوان اسے کہاں سے کہاں لے جائیں گے۔ لڑکیاں اسے گا کر کیسے جھینپیں گی' ماہیا اَن گنت ہے' ماہیا سدا ابہار ہے' ماہیا رنگا رنگ ہے۔"

موضوع بدل کر دیہاتی گیتوں کی بحث کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ اس لیے متین نے اعظم سے ماہیا سننے کا خیال کسی اور موقعہ پر ملتوی کر کے اپنے مشن کی طرف توجہ دی۔ لیکن یہ معلوم کر کے اسے بڑی مایوسی ہوئی کہ اعظم اسکی تجویزوں کو ناممکن العمل قرار دے رہا ہے؛ ہر بات سے اَن گنت خامیاں نکال بیٹھتا ہے' اور انگڑائیاں لے رہا ہے اور جمائیوں کا تار باندھتے ہوئے ہے۔ اس

کی آنکھوں کی خواب آلود سیلن میں ایک التجا جھلملانے لگتی ہے۔ "کیا ہی اچھا ہوتا اگر تم روشندانوں اور گھوروں کا ذکر چھوڑ کر ماہیا کا بول الاپتے اور کنواریوں کی حیاؤں کی باتیں کرتے —— سنگ دل، بے رحم، بڈھے کھوسٹ —— " لیکن متین بضد تھا کہ اعظم قائل ہوتا چلا جائے، اور وہ متین کو بضد دیکھ کر بادل ناخواستہ قائل ہوتا چلا گیا۔ اب ہر بار وہ متین کی ہاں میں ہاں ملا دیتا تاکہ ایجنڈا کی اگلی شق شروع ہو اور یہ تربوز کے چھلکے چبانے کا کام جلد سے جلد ختم ہو جائے اور وہ اسے نئی تازی کلیاں سنائے اور اس سے پوچھے کہ ماہیا کی اس کلی کا مطلب کیا ہے:

ڈھولا جھولی رات سویلے ڈھم گئی آ

(میرا محبوب! میرے آغوش میں ہے، شاید اسی لیے آج رات وقت سے پہلے بیت گئی اور پَو بے وقت پھوٹی)۔

"گھورے گلیوں میں نہیں ہونے چاہئیں۔" متین اپنی دھن میں مست تھا۔ "ان پر مکھیاں بیٹھتی ہیں، جو وہاں سے غلاظت بھری ٹانگیں لے کر اڑتی ہیں اور کھانے کی چیزوں پر آ بیٹھتی ہیں۔ گھورے بدبو پھیلاتے ہیں۔ گھورے ہوا کو مکدّر کرتے ہیں۔ گھورے گلیوں کی خوبصورتی کو گنوا دیتے ہیں، گھورے ——"

"اور پھول —— اور کلیاں —— اور ستارے —— اور آنکھیں؟ ——" مگر متین نے اعظم کی خاموش فریادیں نہ سنیں اور پھر تنگ آ کر اعظم نے کہا۔ "مگر ہم کوڑا کرکٹ کہاں لے جائیں؟"

"باہر کھیتوں میں۔" متین کا مطالعہ یہی کہتا تھا۔

"تو اِس کا مطلب یہ ہے کہ صبح سویرے گاؤں کی آدھی آبادی کوڑے کے ٹوکرے اٹھا کر دو دو تین تین کوس دور کھیتوں میں چلی جائے، اور گھر میں ننھے بچے بلکتے رہیں، اور دہی پانی چھوڑ جائے، اور کھانا دن ڈھلے تیار ہو

اور ——"

"گھر کے باقی لوگ —— وہ یہ کام کر سکتے ہیں۔"

"اِتنے بہت سے کام! اور پھر جس کے گھر میں اَور کوئی نہ ہو۔"

"ہو سکتا ہے، ہو سکتا ہے سب کچھ۔ صرف اگر یہ روز کا معمول بن جائے، تو سب مشکلیں آسان ہو جائیں۔"

"عجیب بات ہے! خیر آگے چلیے!"

"انسان اور مویشی الگ الگ احاطوں میں ہونے چاہئیں۔"

"اور جس کے ہاں صرف ایک احاطہ ہو؟"

"وہ دوسرا بنوا لے۔"

"اور جو بہت غریب ہو۔"

"وہ بھی بنوا سکتا ہے، صرف ہمت کی ضرورت ہے۔"

"دولت کے بغیر ہمت تو تمباکو بغیر چلم کا معاملہ ہے۔ خیر آگے چلیے۔"

"شادی بیاہ اور موت فوت کے موقعہ پر بڑی بڑی دعوتیں نہیں دینی چاہئیں ۔ بلکہ یہ روپیہ گاؤں کے بیت المال میں جمع ہو جانا چاہیے۔ اِس رقم سے سارے گاؤں کے بھلے کے کام کیے جا سکتے ہیں۔"

"اچھا خیال ہے مگر گاؤں والوں میں اتفاق بھی تو ہو۔"

"اتفاق و اتحاد —— یہ میرے پروگرام کا ایک الگ مسئلہ ہے۔"

"اور ناک؟"

"ناک —— کیا مطلب؟"

"خاندان کی ناک کو کون سنبھالے گا۔ شادی بیاہ پر دعوت نہ ہو تو کیا منہ پر ناک باقی رہ جائے گی؟"

"کہاں جائے گی؟"

"کٹ جائے گی۔"

"نہیں کٹتی ناک۔ یہ غلط بات اور غلط محاورہ ہے۔"
"اور جو دعوت دینے پر مُصر ہو۔"
"اُسے برادری سے خارج کر دینا چاہیے۔"
"یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ ہمارے یہاں یہ ناممکن ہے۔"
"سب کچھ ہو سکتا ہے۔"
"خیر آگے چلیے۔"
"لڑکیوں کی تعلیم۔"
"لڑکیوں کی تعلیم؟"
"ہاں لڑکیوں کی تعلیم —— ہونے والی بیویوں اور ماؤں کی تعلیم۔"
"کیا فائدہ؟"
"پڑھی لکھی مائیں زیادہ تندرست بچے جَنتی ہیں۔"
"مَیں ایک اَن پڑھ ماں کا بچہ ہوں، مجھے دیکھیے ——" اور پھر اعظم کی نظریں جیسے کہہ رہی تھیں —— "اور مَیں گھر سے آئینہ لئے آتا ہوں؛ ذرا خود کو بھی دیکھیے۔ آپ جو پڑھی لکھی ماں کے صاحبزادے ہیں، زرد رُو اور جلے سڑے اور مَیں —— انار کی کلی کی طرح سرخ اور آبنوس کی لکڑی کی طرح مضبوط ——!
"مَیں دوسروں کی بات کر رہا ہوں۔" متین نے کہا۔
"مگر معاف کیجیے گا بھائی صاحب، میں نے تو سنا ہے کہ پڑھی لکھی مائیں سرے سے بچے جَنتی ہی نہیں۔"
"بہت بچے بھی تو نہیں جَننے چاہئیں۔"
"کسی کا بس تھوڑا ہے۔"
"ولایت نے دوائیں نکالی ہیں قسم قسم کی۔"

"اور جس پر دوا اثر نہ کرے۔"
"یہ بعد کی باتیں ہیں۔"
"خیر —— آگے چلیے۔"
اور اس طرح متین نے اعظم کے سامنے گھُوروں سے لے کر برتھ کنٹرول تک اور تعلیم نسواں سے لے کر جڑی بُوٹیوں کی تجارت تک ایک لمبا چوڑا پروگرام وضع کر لیا، اور دن ڈھلے سے کچھ دیر بعد اپنے مشن کی بنیاد اٹھا کر ایک ایسے زور کی انگڑائی لی کہ اس کے بند بند نے تالی سی بجا دی۔ اور پھر اعظم کے قریب کرسی لے جا کر بولا۔
"تمہیں تو شاید نیند آ رہی ہے اعظم۔"
لیکن اعظم کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ دراصل وہ متین کے خشک پروگرام سے تنگ آ گیا تھا اور سوچ رہا تھا کہ آج شام کو اس نوجوان کی جانے چوپال پر کیا آؤ بھگت ہو گی۔ مہمان ہونے کی وجہ سے متین کے پروگرام کے علاوہ یہ خود ان کی اپنی عزت کا معاملہ تھا۔ اور وہ سوچ رہا تھا کہ آج رات متین کا اندھا دھند ساتھ دے کر وہ لوگوں کو کیسے یقین دلائے گا کہ شادی بیاہ پر بڑی بڑی دعوتوں کا انتظام نہ کرنے سے ناک کٹتی نہیں بلکہ اَور بڑھ جاتی ہے۔
"نہیں نہیں جی۔" اس نے کہا۔ "نیند نہیں آ رہی، میں دن کو سونے کا عادی نہیں ہوں۔"
"کوئی بات سناؤ گاؤں کی۔ میرا تمہارا مدّتوں کا ساتھ ہو گا، اور مَیں تو تمہاری ذہانت دیکھ کر بہت خوش ہُوا ہوں۔"
"کیا بات سناؤں؟ آپ پوچھیں تو میں جواب دیتا چلا جاؤں۔"
"کیسے ہیں یہاں کے لوگ؟" متین نے یونہی ایک سوال پوچھا۔
"بہادر اور بے وقوف۔" اعظم نے کہا۔ "ابّا کہا کرتے ہیں کہ ہمارے گاؤں کے، بلکہ ہمارے علاقہ کے لوگ بہت بہادر اور سخت بے وقوف ہیں اور

میں تو کہتا ہوں کہ دانا آدمی بہادر ہو ہی نہیں سکتا۔ بہادروں کا سا کام کرنے سے پہلے وہ سوچے گا کہ یہ میں کیا کر رہا ہوں، اور جس نے ایسے کاموں کے بارے میں سوچا وہ بھاگ نکلا۔"

"مطلب کیا ہے تمہارا؟" متین نے اعظم کے مفروضے سے سخت اختلاف ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ "کیا بہادر بننے کے لیے سخت بے وقوف ہونا ضروری ہے۔"

"یہ مطلب نہیں میرا—— اکثر بے وقوف بزدل ہوتے ہیں۔ ساتھ ہی بزدلی بھی تو بیوقوفی ہے، اور بہادری بہت بڑی دانائی ہے، لیکن جو دانائی کے سلسلے میں سوچ میں پڑ گیا، وہ بہادری کا کام نہ کر سکا۔ سو یہاں کے لوگ بہادر اور بیوقوف ہیں۔ ہر شخص کی اپنے پڑوس سے دشمنی ہے۔ رات کو ہر شخص کے تکیے تلے چھرا اور برچھے کا پھل یا پستول ضرور موجود ہوتا ہے۔ ایک ذرا سی بات پر خون خرابہ ہو جاتا ہے۔ ایک شخص پتھر کو پتھر کہہ رہا ہے تو ناممکن ہے کہ اس کا مخالف شخص پتھر کو پتھر کہے؛ وہ پتھر کو اینٹ ہی کہے گا اور اپنی بات منوانے کے لیے ہاتھا پائی پر اُتر آئے گا۔"

"یہ ساری باتیں میرے پروگرام میں اتفاق و اتحاد کی ذیل میں آ جاتی ہیں۔"

متین پھر اپنے پروگرام کی طرف مائل ہو رہا تھا، اور اعظم کے لیے ایک جاں فرسا عذاب شروع ہونے والا تھا، اس لیے وہ کسی کام کے بہانے اٹھ کر چلا گیا—— گاؤں کے بچے چوپال پر بنٹے کھیلنے آئے، تو چوپال اور پتھر کی سلوں کی صفائی اور کوٹھڑی میں میز کرسی اور پلنگ دیکھ کر دروازے پر جمع ہو گئے۔ اور گھور گھور کر متین کو دیکھنے لگے۔

"بھاگ جاؤ۔" اعظم گھر کی طرف سے پکارا، اور سب دوڑ گئے۔ مگر تھوڑی دیر بعد جمع ہو گئے اور ناکوں میں انگلیاں گھماتے متین کو گھورنے لگے۔

"کیا دیکھتے ہو—— یہ کوئی چڑیا گھر تھوڑا ہے۔" متین نے غصے سے کہا۔

اور سب زور زور سے ہنستے اِدھر اُدھر بکھر گئے مگر پھر اکٹھے ہو گئے۔

اعظم نے ان کا پیچھا کیا، اور جب سب کو گلی کے سرے تک پہنچا آیا تو دوسری گلی سے آ کر پھر متین کو، اس کے لباس کو، اس کی گھبرائی ہوئی صورت کو دیکھنے لگے اور اعظم انہیں بے نُقط سناتا دوسری گلی میں دوڑ گیا۔

ظُہر کے بعد گلی میں سے گزرتے ہوئے دہقان السلام علیکم کہہ کر اندر آتے، اور متین سے مؤدبانہ مصافحہ کرتے، اسے حیرت سے دیکھتے۔ اِس حیرت میں عقیدت کم تھی اور حیرت زیادہ۔ وہ اعظم سے زمینوں اور فصلوں کی باتیں کرتے اور شام کے جلسے میں شرکت کا وعدہ کر کے چلے جاتے۔

ایک جگہ دیر تک بیٹھے بیٹھے متین تھک گیا تو اعظم کو ساتھ لے کر گاؤں سے باہر جانا چاہا۔ گلیوں کے موڑوں پر بچے مزے سے بیٹھے رفع حاجت میں مصروف تھے اور چنے چبا رہے تھے۔ ایک بچی کوڑے کے ایک ڈھیر میں سے اپنی گڑیوں کے لیے رنگین چیتھڑے تلاش کر رہی تھی اور ایک ٹُکڑ پر چند دہقان حقہ پی رہے تھے۔

"بھئی ایمانداری اچھی چیز ہے، پر یہ ایمانداری ہمارے کس کام کی؟ ایماندار تھانیدار سب کے لیے مصیبت ہے کھانے پینے والا افسر ہو تو جیب بھرو اس کی اور مطلب پورا کر لو۔ اب یہ تھانیدار ہے، کوڑی تک نہیں لیتا۔ ٹھیک ہے، پر کس قاتل کو چھڑا لیا اس نے؟ جو قتل کرتا ہے پھانسی پر جا لٹکتا ہے۔ آخر یہ کہاں کا انصاف ہے؟"

متین کے پروگرام میں ایک اور شق شامل ہو گئی اور وہ اس فلسفے پر متحیّر ہوتا آگے بڑھا تو عورتوں کی ایک ٹولی گاگریں سر پر جمائے آ رہی تھی۔ تنگ گلی تھی۔ وہ دیوار سے لگ گیا اور عورتیں ہنسی ضبط کرتی، اس کے چار طرف ایک

عجیب سی سرسراہٹ بکھیرتی گذر گئیں۔

"چھپکلی کیا چمٹی ہو گی!" قطار کی آخری عورت نے کہا' جس کی آنکھوں کو کاجل کی دھار نے سنوار رکھا تھا اور جس کے ہونٹ سرخی کی افراط سے سیاہ ہو رہے تھے۔

اعظم مارے غصّے کے لال ہو گیا اور گھبرائے ہوئے متین کو ایک ویران سی گلی سے نکالتا باہر کھیتوں میں نکل گیا۔

(7)

شام کو بابا حاجی واپس آ گیا۔ ڈبّو نے متین کے ارد گرد چکر لگائے۔ بڑھیا خود ہی گرتی پڑتی متین کو کھانے پر بلانے آ نکلی اور جب متین کھڑکے کو پار کر کے صحن میں داخل ہوا تو سرخے نے ایک ہنگامہ مچا دیا۔ اعظم مارے غصے کے لٹھ اٹھا کر سرخے کی طرف لپکا مگر متین نے روک دیا۔ متین کی آواز سن کر سرخے کے غصے میں اور شدّت آ گئی۔ جب تک متین صحن میں موجود رہا' سرخے نے ایک لمحے کے لیے بھی خاموشی اختیار نہ کی۔ پڑوس کی چھت پر سے پنشنر صوبیدار فوجی زبان میں پکارا۔

"آج کتّا فرنٹ معلوم ہوتا ہے' آٹے کی مشین مافق بول رہا ہے۔ اسے ہالٹ کراؤ۔ صحن کے وچ میں نہ باندھو۔ کوٹھے کے وچ میں رکھو۔"

اور بابا حاجی کھانا کھاتے ہوئے بولا۔ "چچ چچ چچ' بے چارے اچھے خاصے انسان کو اِس زبان نے اُلّو بنا دیا ہے' ہائے بے چارہ—— چچ چچ چچ —— بہت اچھا بہت اچھا۔" اس نے بلند آواز سے کہا۔ "صوبیدار جی میں اس لفنگے کو ابھی ہالٹ کراتا ہوں؛ اصل میں ادھر سے ایک کُتیا گزر——"

"شرم نہیں آتی۔" بڑھیا نے غصے سے کہا۔

صوبیدار نے زور سے ہنس کر ہانک لگائی۔

"وَیل —— مارچ کرو۔ ہالٹ کیوں ہو گئے۔"

"تیری ماں کا سر۔" حاجی نے ہولے سے کہا۔ "اِدھر اعظم کی ماں کفگیر سے سر کو دو کرنے پر تُل گئی ہے اور وہ مارچ کرنے کو کہہ رہا ہے۔"

اعظم نے ہنسی کو روکنے کی بہت کوشش کی مگر آخر ضبط نہ کر سکا اور کھانا چھوڑ کر اندر بھاگ گیا اور بڑھیا اپنے بیٹے کی ہنسی سے خوش ہو کر بولی۔ "اِس صوبیدار کو تو' اعظم کے ابّا تم پاگل بنا دو گے ایک دن۔ کیوں چھیڑتے ہو بیچارے کو۔ شہر میں رہا ہے' شہروں کا اثر ہے' کیا کرے۔"

اور متین بل کھا کر رہ گیا' جیسے بڑھیا نے اسے گالی دی ہے۔

کھانے سے فارغ ہو کر تینوں نے چوپال کا رخ کیا۔ سارا گاؤں ان سے پہلے ہی چوپال پر جمع تھا۔ اُپلوں کا بوجھل دھوآں —— چوپال کے صحن پر منڈلا رہا تھا اور بچے چوپال کی چار دیواری سے باہر حیران کھڑے تھے۔ متین کے آتے ہی خاموشی چھا گئی۔ ان تینوں کے لیے ذیلدار نے ایک الگ پلنگ بچھوا رکھا تھا۔ متین کی مزاج پرسی کی گئی اور ذیلدار کی اجازت سے متین نے نہایت ذمہ دارانہ حیثیت میں تقریر شروع کی۔

"یہ صحیح ہے" اس نے دورانِ تقریر میں کہا" کہ تم لوگ میری نیت پر شک کرنے کا حق رکھتے ہو اور کہہ سکتے ہو کہ اس شخص کو دوسروں کا غم کیوں کھائے جا رہا ہے۔ پر میرے بھائیو' دنیا کے تمام انسان ایک جسم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جسم کے ایک عضو کو تکلیف پہنچے' تو کیا سارا جسم نہیں کانپ اٹھتا؟ پھر کیا یہ ممکن ہے کہ دیہاتی بھائی طرح طرح کی مصیبتوں میں گرفتار ہوں اور ہم شہری ان کے دکھوں سے بے خبر ہیں؟ ناممکن ہے۔ شرط یہ ہے کہ جسم کا کوئی عضو مردہ نہ ہو۔ شرط یہ ہے کہ تمام انسانوں کے دل زندہ ہوں—— میں نے تعلیم حاصل کی۔ میرے والدین مجھے ڈپٹی کمشنر بنانا چاہتے تھے مگر میں نے

دیکھا کہ میرے دیہاتی بھائی شہریوں سے کتنے پیچھے ہیں۔ پرانے رواجوں، بھونڈی رسموں، عجیب و غریب وہموں میں وہ بری طرح مبتلا ہیں۔ میں انہی رسموں رواجوں کو توڑنے پھوڑنے آیا ہوں۔ میں ان وہموں کو تمہارے دلوں سے نکالنے آیا ہوں، اور تمہیں بتانے آیا ہوں کہ تم اگر اناج پیدا کرنا چھوڑ دو تو بادشاہوں کے محلّوں کے فانوس بجھ جائیں۔ تم اگر ہل نہ چلاؤ تو ہواؤں میں اُڑتے ہوئے ہوائی جہاز اور سمندروں پر تیرتے ہوئے اسٹیمر رک جائیں۔ تمہارے ہی دم قدم سے اِس دنیا میں رونق ہے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ بادشاہ کے سر کے تاج میں چمکتا ہوا موتی تمہارے ہی کسی مزدور بھائی نے پہاڑ سے نکالا تھا۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ تمہارے افسروں کے خوبصورت لباسوں کی بنیاد سب سے اول بھیڑیں چراتے ہوئے چرواہوں اور کپاس اگاتے ہوئے کسانوں نے رکھی تھی۔ میں تم سے صرف یہ پوچھتا ہوں کہ جب دنیا کا کارخانہ صرف تمہارے دم سے چل رہا ہے تو تم دکھی کیوں ہو؟ تم دوسروں کو صحت بخشتے ہو اور خود بیمار رہتے ہو، کیوں؟ تم دوسروں کو خوش کرتے ہو اور خود دکھی رہتے ہو، کیوں؟ تم دوسروں کو خوبصورت لباس پہناتے ہو اور خود ننگے رہتے ہو، کیوں؟ میں پوچھتا ہوں کیوں؟ کیوں؟ کیوں؟ کیوں؟"

اِس طرح اپنے پروگرام کی طویل تمہید باندھ کر اس نے اپنے پروگرام کی فہرست پیش کی۔ وہ رشوت ستانی کو روکنے کی تجویز کا ذکر کر رہا تھا تو قریب کی ایک مسجد میں مؤذّن نے عشا کی اذان دی، مگر وہ بولتا چلا گیا۔ لوگوں نے پہلو بدلے، اور آخر ایک کونے سے کوئی بولا۔

"ذرا رک جاؤ میاں، اذان ہو رہی ہے۔"

ایک سنّاٹا چھا گیا۔ جب مؤذّن نے "اشہد ان محمد الرسول اللہ" کہا تو دہقانوں نے ہاتھوں کو جوڑ کر انہیں چوما، آنکھوں اور ماتھے پر لگایا اور سب یک زبان ہو کو بولے۔

"صدقے یا رسولؐ اللہ۔"

اور جب اذان ختم ہوئی تو سب نے کلمۂ توحید پڑھا اور پھر بابا حاجی بولا۔

"اچھا تو متین میاں ——— اب آگے چلو۔"

لیکن متین پر سکتے کا عالم طاری تھا۔ اُن لوگوں کے مذہبی جذبات کتنے گہرے گمبھیر اور ہمہ گیر ہیں اور کتنی عقیدت ہے انہیں اپنے محمدؐ سے، جس کا نام سن کر انہوں نے "صدقے یا رسولؐ اللہ" کہا اور اذان کے دوران میں ایسی خاموشی اختیار کی کہ سوئی بھی گرتی تو آواز سنائی دے جاتی۔ یہ ازلی و ابدی احترام انہیں کس نے سکھایا، اور یہ مذہبی خلوص انہوں نے کہاں سے حاصل کیا؟

"فی الحال اتنا ہی کافی ہے۔" اس نے کہا۔ "مَیں اِن باتوں کے متعلق اب آپ کی رائے لینا چاہتا ہوں۔"

سب سے اوّل ذیلدار بولا اور اس نے آن کی آن میں متین کے پروگرام کی دھجّیاں بکھیر دیں۔ بابا حاجی نے کئی مقامات پر ذیلدار کو ٹوکنا چاہا۔ اعظم نے پاگلوں کی طرح ذیلدار سے بحث شروع کر دی مگر گاؤں والوں کی اکثریت ذیلدار کی ہم خیال تھی۔ وہ یہ برداشت نہیں کر سکتے تھے کہ ان کی بہو بیٹیاں سردی میں کوڑے کرکٹ کے ٹوکرے اٹھائے پھریں، اور شادیاں جنازوں کی طرح انجام پائیں، اور مویشیوں کی الگ "بیٹھکیں" بنائی جائیں اور ان کی لڑکیاں پڑھنے لگیں۔

"——— اور کتابوں میں عشق کی باتیں پڑھیں۔" ذیلدار نے کہا۔

'اور بڑی ہو کر اپنے عاشقوں کو غزلیں لکھیں اور بھاگ جائیں۔"

"کتابوں میں صرف عشق کی باتیں تو نہیں ہوتیں۔" متین نے جدید ادب کے ایک حصے کو معیار بنا رکھا تھا۔

"میں نے جو کتاب اٹھائی اس میں آنکھوں سے آنکھیں لڑیں اور بے ہوشیاں طاری ہونے لگیں اور اغوا ہونے لگے اور اغوا نہ ہوئے تو زہر کی پڑیا' یا دریا کا پیٹ یا چھت سے لٹکتی ہوئی رسّی قصّہ تمام کر گئی۔" ذیلدار کا مطالعہ تیسرے درجے کے ناولوں تک محدود تھا۔

مگر متین نے اصرار کیا کہ محض تجربتہً اس کی چند تجویزوں کو قبول کر لیا جائے اور آخر بڑی بحث و تمحیص کے بعد طے پایا کہ فی الحال مویشیوں کے الگ تھان بنائے جائیں اور سارے گاؤں میں' گاؤں سے باہر' صرف دو بڑے گھُورے ہوں اور لڑکیوں کو اُردو پڑھائی جائے مگر کتابیں ایسی ہوں جن میں نماز' روزہ' حج' زکوٰة اور طہارت وغیرہ کی باتیں ہوں۔

"ہمارے ہاں تو پہلے سے ایک اسکول ہے۔" کونے میں بیٹھے ہوئے سردار گھڑونجا سنگھ نے کہا۔ "اور مویشی ہیں نہیں' اس لیے کوڑا کرکٹ بھی نہیں——" اور وہ یوں اٹھا جیسے اسکول کے ماسٹر جی نے اسے وقت سے پہلے چھٹی دے دی ہے۔

اُس روز متین کو بہت دیر تک نیند نہ آئی۔ وہ ایک مُصلح کے درجہ سے بلند ہو کر اپنے آپ کو قائد سمجھنے لگا تھا۔ اس غلیظ گاؤں کو اس کے تصوّر نے اپنی تجاویز کے زور سے صفائی اور نفاست کا ایک مرقّع بنا دیا اور پھر صفائی اور نفاست کی یہ رَو گاؤں گاؤں چلنے لگی اور متین کے خیالوں میں اس کا وجود پھیل کر زمین سے آسمان اور مشرق سے مغرب تک چھا گیا۔ آدھی رات تک اس کی سانس میں تیزی رہی۔ اس نے کروٹوں کی چرخیاں بنائیں' بستر کی چادر سمٹ کر رسّے کی طرح اس کی پیٹھ میں چبھنے لگی اور جب وہ صبح کو اٹھا تو بالکل نیا انسان تھا جس نے اگرچہ اپنے والدین کی امیدوں کو تشنہ رکھا مگر اپنے عزم کے مطابق ایک ایسے کام کی ابتداء کی جو نہ گاندھی سے ہو سکا نہ جناح سے؛ جس کا خیال نہ نہرو کو آیا نہ آزاد کو' جو ابتداء سے انتہا تک اس کا اپنا تھا۔ تصوّر ہی

تصور میں اس نے لاہور کی مال اور دلّی کے کناٹ پلیس اور کلکتہ کی چورنگی اور بمبئی کی چوپاٹی کے آس پاس اپنے مرمریں مجسّمے دیکھے اور عقیدتمندوں کا ایک جمِ غفیر اور اس کے قدموں میں پھولوں کے گلدستے اور——!

اچانک گلی سے گزرتی ہوئی ایک بھینس نے اس کے پلنگ کے پاس ہی گوبر کی ایک پہاڑی کھڑی کر دی' اور وہ مارے غصّے کے چادر پرے ہٹا کر اٹھ بیٹھا——اعظم آیا تو اس سے پوچھا۔

"مویشیوں کا گوبر اٹھانے کا کیا انتظام ہے؟"

"ابھی کوئی لڑکی اٹھا لے جائے گی اُپلوں کے لیے۔" اعظم نے کہا۔

"اور اگر کوئی لڑکی نہ آئی تو یہ گوبر خشک ہو کر گلی کی خاک میں مل جائے گا۔"

"اور اُڑ کر لوگوں کے پھیپھڑوں میں جائے گا۔" متین نے کہا۔

اعظم ہنسنے لگا۔ "اب کیا کیا جائے بھائی صاحب' یہاں خاکروب تو ہیں نہیں کہ گلیوں کی روزانہ صفائی کریں۔"

"بہت بُری بات ہے۔" متین نے گوبر کی طرف دیکھا' جس پر آن کی آن میں عجیب الخلقت بھبھونیاں کہیں سے اڑ کر جمع ہو گئی تھیں اور اپنی لمبی لمبی ٹانگوں سے گوبر کی ننھی ننھی گولیاں ڈھالنے میں بے طرح مصروف تھیں۔

بابا حاجی نے وہ دن متین کے لیے وقف کر دیا اور دوپہر سے پہلے چند ننھّی منّی مَیلی کچیلی لڑکیوں کو جمع کر کے متین کے پاس لے آیا۔ اعظم کے ہمراہ متین نے سارے گاؤں کا چکّر لگایا اور اسے یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ لوگ پرانے گھُوروں کو کھود رہے تھے اور ایک حویلی میں مستری مویشیوں کے لیے ایک الگ احاطہ بنانے میں مصروف تھے۔ اپنی تقریر کا ایسا فوری اثر دیکھ کر متین پُھولے نہیں سماتا تھا اور اس کا جی چاہتا تھا کہ آج پھر وہ گویّا چھوکرا آ نکلے اور وہ اس سے قسم قسم کے دوہے سنے اور سنتا رہے' سنتا رہے——وہ اپنے آپ کو بے حد ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔

(8)

چند روز باقاعدہ کام ہوتا رہا۔ متین کے پاس لڑکیوں کی تعداد روز بروز بڑھنے لگی۔ اب ننھی بچیوں کے علاوہ چند ایسی لڑکیاں بھی آنے لگیں جو سینے پر چادر کے کھسکتے ہی گلابی پڑ جاتی تھیں اور جن کی پلکوں کے سائے ان کے گالوں پر کانپتے رہتے تھے۔ متین انہیں حروفِ تہجی کا درس دیتا۔ بڑی لڑکیوں کو "تو جا ——مَیں آیا۔ مَیں دوڑا' سب آئے" کا سبق سکھاتا۔ شام سے پہلے اعظم کو ہمراہ لے کر مویشیوں کے نئے تھان دیکھنے چلا جاتا اور گندی گلیوں میں کھلتے ہوئے دروازوں پر کھڑے ہو کر دہقانوں کو باہر بلاتا اور ان سے درخواست کرتا کہ گلی کے اپنے حصے کی صفائی وہ اپنے ذمے لیں۔

ایک صبح کو متین اکیلا ایک گلی میں سے گزر رہا تھا کہ اسے گلی کے نکڑ پر کوڑے کی چند ڈھیریاں نظر آئیں جو تازہ پھینکی گئی تھیں۔ اُدھر سے ایک لڑکی بڑھی اور ٹوکری اُلٹ کر مڑنے لگی تو متین نے کہا۔

"یہ کُوڑا یہاں کیوں پھینکا؟"

لڑکی مارے خوف کے کانپنے لگی اور پھر روتی ہوئی قریب کے ایک گھر کی طرف بھاگ گئی۔ اِتنے میں ایک عورت آستین چڑھاتی باہر نکلی۔ اس نے آنکھوں کو کاجل سے سنوار رکھا تھا' اور اخروٹ کی چھال سے ہونٹوں کو اتنا سرخ کیا تھا کہ وہ سیاہ ہو گئے تھے۔ وہ تنک کر بولی۔

"کیا ہے بے؟"

"لڑکی نے یہ کُوڑا یہاں کیوں پھینکا؟"

"اچھا کیا جو پھینکا۔ یہ تیرے باپ کی جاگیر نہیں۔" عورت تو جیسے اسے نگل جائے گی۔

"تمہارے بھلے کی بات ہے۔" متین نے نرمی سے کہا۔ "گلی سارے گاؤں کی جاگیر ہے اور دعائے خیر کہی جا چکی ہے کہ کوڑا یہاں نہ پھینکا جائے۔"

"ہم تو یہیں پھینکیں گے۔"

"مَیں ذیلدار کو بتاؤں گا۔"

"بتا دے جا کر اُس اپنے باپ کو۔ وہ کیا کر لے گا میرا۔ اپنے بابا حاجی کو بھی بتا دے اور اُس اپنے دوست اعظم کو بھی۔ چل پڑا ہے کہیں سے گاؤں سدھار کرنے' ماں کا لاڈلا——اونہہ۔"

غصّے سے تپا ہوا وہ گھر آیا۔ اعظم کو سارا حال بتایا۔ معلوم ہوا کہ وہ عورت بابا حاجی کے پرانے دشمن خاندان سے ہے۔ "مرد یوں ٹوکتا تو چھٹی کا دودھ یاد دلا دیتا سالے کو' پر عورت ذات پر ہاتھ کون اٹھائے۔"

اچانک ایک میراسی ہانپتا ہوا آیا اور بولا۔ "احمد بیگ کے دو بیل چوری ہو گئے۔"

"اِن صاحب کو گالیاں دے رہا ہے کہ انہوں نے الگ احاطہ بنانے کو کہا تھا—— یہ چوروں سے ملے ہوئے ہیں۔ چوکیدار تھانے جا رہا ہے۔ میں نے کہا اعظم کو بتا دوں کہ اِن صاحب کو احمد بیگ کے گھر کی طرف نہ لے جائے۔ وہ غصے سے پاگل ہو رہا ہے۔"

"اِس میں میرا کیا قصور ہے!" متین نے حیران ہو کر پوچھا۔

لیکن اعظم' بابا حاجی کی موجودگی میں کوئی فیصلہ نہ کر سکا کہ اپنے مہمان کی حفاظت کیسے کرے؟ متین کو کوٹھڑی ہی میں بیٹھے رہنے کی تاکید کر کے وہ گاؤں سے باہر کھیتوں میں اپنے باپ کے پاس چلا گیا۔ کافی دیر کے بعد دونوں واپس آئے۔ بابا حاجی غصّے کے مارے کانپ رہا تھا۔ اندر جا کر اس نے سر پر دو تین پگڑ لپیٹے——ایک لمبے دستے والا کلہاڑا اٹھا کر اور اعظم کے ہاتھ میں برچھا تھما کر متین کے پاس آیا——!

"بات یہ ہے میاں۔" اس نے کہا۔ "کہ تمھاری عزّت ہماری عزّت ہے۔ احمد بیگ کہاں کا ایسا تیس مار خان ہے کہ تمھیں گالیاں دے، یعنی ہمیں گالیاں دے۔ کیا وہ کل کا واقعہ بھول گیا جب اس کی بہو نے شادی کے دو مہینے بعد بچہ جن دیا تھا۔ منہ پر ناک نہیں اور چلا ہے لفنگا میرے منہ آنے —— چلو اعظم بیٹا۔"

متین ایسے ہولناک ردِ عمل کا تصوّر تک نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے ذہن میں اچانک چیخیں اور خون اور ہتھکڑیاں اور پھانسی کی رسّیاں تیرنے لگیں اور وہ حاجی کے پیچھے بھاگا۔

"جانے دو بابا —— خواہ مخواہ ——"

"چچ چچ چچ۔" بابا حاجی کی ناک اور ماتھے پر پسینہ اُمڈ رہا تھا۔ "خواہ مخواہ! ارے یہ خواہ مخواہ کا جھگڑا ہے؟ ہم اپنی حفاظت کے لیے جا رہے ہیں اور تو کہتا ہے خواہ مخواہ —— چچ چچ چچ —— آخر شہری ہونا۔"

اور متین بل کھا کر رہ گیا، جیسے بابا حاجی نے اسے گالی دی ہے۔

بابا حاجی کا شور و غوغا سن کر اس کی برادری کے کئی افراد لٹھیں، کلہاڑے اور برچھے تھامے باہر نکل آئے اور ایک غرّاتا ہوا ہجوم احمد بیگ کے گھر کی طرف چلا۔

متین دیر تک حواس باختہ، گلی میں کھڑا رہا۔ کچھ دیر کے بعد اس کے قریب سے ایک جوان لڑکی گذری۔ کچھ دور آگے جا کر وہ پلٹی اور متین سے پوچھا۔

"جی یہ شور کیسا تھا؟"

اِس آواز میں نسائیت کے وہ تمام ترنم لرزاں تھے، جن کے متعلق تخلیقِ آدم سے لے کر آج تک شاعروں نے گیت لکھے اور مصوّروں نے تصویریں بنائیں۔ ذہنی افراتفری کے باوجود متین اس آواز کے سحر کو محسوس

کئے بغیر نہ رہ سکا، اور پھر اس لڑکی کی آنکھیں صبح کی طرح منوّر اور شام کی طرح متوالی؛ اور پھر اس کی چال —— گویا چھوکرا اپنا اِکتارہ بجاتا اور دوہے الاپتا اس ایک لمحے میں کتنی دیر تک ناگنوں، موروں، ستاروں اور بادلوں کے پھول برساتا رہا۔ کتنی زبردست سچائی تھی اس کے دوہوں میں —— اور اچانک اس کی رگوں میں مسرت کی ایک لہر دوڑ گئی، جیسے اس لڑکی نے متین کو اپنا مخاطب بنا کر دنیا جہان کی نعمتوں کا اس کے قدموں میں ڈھیر لگا دیا ہے۔ ایک عجیب سرسراہٹ سی اس کے اعصاب میں گھلنے لگی، اور وہ آواز اور چال اور آنکھوں کی تہ بہ تہ دھند کے نیچے سے نہایت مدھم اور نرم آواز میں بولا۔

"احمد بیگ کے بَیل چوری ہو گئے ہیں۔ اس نے مجھے برا بھلا کہا ہے کہ مَیں نے ہی اسے الگ احاطہ بنانے کو کہا تھا —— بابا حاجی اور اعظم میری خاطر اس سے باز پرس کرنے گئے ہیں۔"

"اور تم یہاں کھڑے ہو؟" لڑکی نے جیسے اس کے منہ پر کالک پھیر دی۔

"میرے پاس ہتھیار نہیں۔" متین نے فوراً بہانہ تراشا۔

"مرد کے بازو ہی اس کے ہتھیار ہیں۔" لڑکی کی بھرپور جوانی چھلکنے لگی۔ "خاک پڑے احمد بیگ کے منہ میں جس نے دادا حاجی کے مہمان کو گالیاں دیں۔ غارت ہو مُوا۔"

اور متین کچھ سوچے سمجھے بغیر کوٹھڑی کو کھلا چھوڑ کر دوڑتا ہوا لڑکی کے قریب سے گزرتا گلی کے اُس پار نکل گیا۔ ایک مجنونانہ جوش کے ساتھ وہ بہت بڑے مجمع کی طرف بڑھا۔ سامنے چھتوں پر احمد بیگ اور اس کی برادری کے لوگ ہتھیار لئے کھڑے تھے۔ اور گلی کے سرے پر بابا حاجی کے ساتھی حملہ کرنے کے لیے بے تاب نظر آ رہے تھے۔ متین کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی ہجوم آہستہ آہستہ بکھرنے لگا اور احمد بیگ کی برادری چھتوں پر سے اترنے لگی۔

"کیا ہوا؟" اس نے اعظم سے پوچھا۔ "آپ بھی آ نکلے۔" اعظم نے حیرت اور مسرت سے کہا اور اسے بتایا کہ ذیلدار او رپیر رؤف علی شاہ بیچ بچاؤ کے لئے آگئے تھے' ورنہ آج احمد بیگ کی برادری کا ایک بچہ تک بھی بچ کر نہ نکلتا۔ بابا حاجی نے بھی متین کو دیکھ کر مسرت کا اظہار کیا' اور جب سب لوگ واپس پلٹے تو متین نے گلی کے نکڑوں پر' چھتوں پر' دروازوں میں' ہر طرف نگاہیں دوڑائیں کہ شاید اسے اپنی "سپہ سالار" کہیں نظر پڑ جائے مگر اسے کامیابی نہ ہوئی۔

کوٹھڑی اور ننھّی چوپال پر دیر تک لوگوں کا مجمع رہا اور اونچی اور گونجیلی آوازوں میں لوگ متین کی تجویزوں کو سراہتے رہے اور احمد بیگ کے دیوانہ پن کو کوستے رہے۔ اور لٹھیں اٹھا اٹھا کر فرش پر پٹختے ہوئے اعلان کرتے رہے کہ متین ان کا بھائی ہے۔ کسی نے ان کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی دیکھا تو اس کا سر قلم کر دیا جائے گا۔

شام سے پہلے وہ اعظم کے ہمراہ کھیتوں میں نکل گیا اور ایک ویران مقام پر پہنچ کر اس نے اعظم سے استدعا کی کہ وہ اسے کوئی ایسا لطیف گیت سنائے کہ آج کے ہنگامے کی یاد دل سے محو ہو جائے' حالانکہ وہ آج کے ہنگامے کی یاد کو اپنے دل میں بسائے رکھنے پر مُصر تھا' اور وہ گیتوں سے اپنے اس ارادے کو تقویت پہنچانا چاہتا تھا۔ اس نے اعظم سے کہا۔

"تم نے پہلے روز ماہیا کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا نا کہ تمہیں بے شمار کلیاں یاد ہیں۔ آج طبیعت کچھ اداس ہے۔ چند کلیاں سنا دو تو شاید جی بہل جائے۔"

اعظم کے لیے یہ فرمائش باعثِ حیرت تھی' کیونکہ گیت اور گانے کا ذکر آتے ہی متین خشک نصیحت بازی پر اتر آتا تھا ـــــ اُس وقت سورج اگرچہ ڈوب چکا تھا مگر ابھی اپنا سارا سونا سمیٹنے نہیں پایا تھا۔ درختوں کے سائے مٹ

چکے تھے اور کھیتوں کی ہریاول پر ایک سرمئی سی اداسی پھیل گئی تھی۔ پرندوں کے غول اڑے جا رہے تھے۔ واپس آتے ہوئے دہقانوں کے آگے آگے چلتے ہوئے مویشیوں کی رفتار میں تھکن اور بیزاری تھی۔

اعظم نے سب سے پہلا ایک ٹپہ چھیڑا:

متھے تے نہ مار   وے ماہی   متھے لیکھ لکھیندے
اکھیاں تے نہ مار   وے ماہی   اکھیاں نور خدا دا
ونداں تے نہ مار   وے ماہی   وند چنبے دی کلیاں
ہتھاں تے نہ مار   وے ماہی   ہتھ رواں دی پھلیاں
سینے تے نہ مار   وے ماہی   سینہ مکہ مدینہ

(اے ماہی' میرے ماتھے پہ نہ مار۔ کیونکہ ماتھے پر مقدر کی تحریریں ہیں۔
اے ماہی' میری آنکھوں پر نہ مار' کیونکہ آنکھیں دراصل خدا کا نور ہیں۔
اے ماہی' میرے دانتوں پر نہ مار' کیونکہ میرے دانت چنبہ کی کلیاں ہیں۔
اے ماہی' میرے ہاتھوں پر نہ مار' کیونکہ میرے ہاتھ (انگلیاں) رواں کی پھلیاں ہیں۔
اے ماہی' میرے سینے پر نہ مار' کیونکہ میرا سینہ حرم ہے تیرے حسین تصورات کا۔)

متین جھوم گیا۔ اعظم اب ماہیا کی طرف پلٹا اور جب اس نے آخری کلی گائی:

رج کے نہ تکیاں اکھیاں سانول یار دیاں

(افسوس' کہ میں اپنے حسین (سانولے) محبوب کی آنکھوں کو جی بھر کر نہ دیکھ سکا۔)

تو متین کے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ کاش وہ اپنے سانول یار کی اکھیاں رج کے' جی بھر کے تکے اور تکتا چلا جائے' اور ـــــ اور ـــــ

"اور کوئی چال کی کلی یاد ہے تمہیں؟" اس نے حریصانہ استدعا کی۔

مگر اب شام ہو گئی تھی اور اعظم فوراً واپس جانا چاہتا تھا۔ اپنے آپ

کو ایک نئی اور تیز رَو میں بہتا ہوا محسوس کر کے متین گھبرا اٹھا اور اعظم کے لحن
کی تعریف کرتا واپس کوٹھڑی میں آ گیا۔ چوپال کے صحن میں وہ کرسی رکھ کر
ہولے ہولے گنگنانے لگا۔

رج کے نہ تکیاں اکھیاں سانول یار دیاں

پرلی طرف سے ایک عورت بڑھی' اور سامنے سے چاند کی چمک نے اس کے
چہرے کو روشن کر دیا۔ ناگنیں کُنڈلیاں مارنے لگیں' مور پر سنوارنے لگے'
ستارے کانپنے اور ٹوٹنے لگے' اور روئی کے گالے کی سی بدلیاں فضا میں
منڈلانے لگیں اور آنکھیں ——— آنکھیں:

رج کے نہ تکیاں اکھیاں سانول یار دیاں

لڑکی گنگناہٹ کی آواز سن کر تیر کی سی تیزی سے اس کے سامنے سے گزر گئی'
اور پھر اعظم آ گیا۔ "آپ تو خود بھی گا لیتے ہیں۔" اس نے کہا اور گلی میں لڑکی
کے چھریرے سائے کو دیکھ کر کچھ سوچنے لگا۔ متین کو اندر گھر لے گیا تو سرخے
نے واویلا مچا دیا۔ غصّے میں اسے دُھن ڈالا۔ صوبیدار نے پرلی چھت پر سے کہا۔
"بوری کے مافق کُوٹ رہے ہو اعظم خان۔ گُڈ۔ کتّا ہے' اِتنا غُصہ نہ
کرو۔"

صوبیدار کو زیرِ لب کئی گالیاں دے کر وہ واپس آیا۔ کھانا کھا کر جب
دونوں اپنی چوپال پر آئے تو اعظم نے کہا۔

"آج آپ نے بہت کم کھایا ——— کیا بات ہے؟"

"طبیعت اداس ہے۔" اس نے گہری سانس لے کر کہا۔

اور اعظم ایک سوچ میں پڑ گیا۔

دوسرے روز جب کوٹھڑی میں لڑکیاں جمع ہونا شروع ہوئیں تو متین
کو ایک بے معنی سی پریشانی کا دورہ پڑ گیا۔ ننھیوں کو "بے تے" اور بڑی
لڑکیوں کو "تُو جا۔ میں آیا" کی رٹ لگوا کر باہر گلی میں آ جاتا؛ گلی کے ایک سرے

سے دوسرے سرے تک یوں نظریں دوڑاتا جیسے زمین پر اتری ہوئی کہکشاں کا
جائزہ لے رہا ہے؛ اندر آ کر کرسی پر گر پڑتا' کروٹیں بدلتا' باہر چوپال کی چوڑی
سِلوں پر بیٹھ جاتا' بنٹے کھیلنے کے سوراخوں کو پاؤں کے انگوٹھے سے کھودتا؛ کچھ
دیر کے بعد ننھی لڑکیوں کو اس نے چھٹی دے دی اور چار بڑی لڑکیوں کو قریب
بلا کر ان سے نئے نئے الفاظ بجھوانے لگا۔

"یہ کیا ہے؟" اس نے تختی پر "بوسہ" کا لفظ لکھ کر نوری سے پوچھا'
جس کی گوری جلد پر جیسے قدرت نے گلاب کے پھول کا رنگ نچوڑ دیا تھا۔

"بوسہ۔" اس نے بے دھڑک کہا۔

"مطلب؟"

اور وہ آنکھیں جھپکانے لگی۔ متین بھی آنکھیں جھپکانے لگا۔ متین کو
دیکھ کر دوسری لڑکیاں بھی آنکھیں جھپکانے لگیں۔ پیٹ اور سینے سے بجلی کی سی
لہریں ابھر کر اس کے گلے میں اٹک گئیں اور پھر بھک سے دماغ میں اچھل کر
اسے چکرا گئیں۔ اپنی ساری ہمتیں سمیٹ کر اس نے کہا۔

"اس کا مطلب ہے چُمی۔"

چاروں لڑکیوں کے گالوں سے جیسے خون پھوٹ نکلے گا۔

متین نے تشریح کا سلسلہ جاری رکھا۔

"مجھے یہ پنجابی لفظ بہت پسند ہے۔ بوسہ سے مجھے بُو سی آتی ہے۔ چُمی
کتنا پیارا لفظ ہے۔ آواز سے مطلب ظاہر ہوتا ہے۔ بھلا کیا مطلب ہے چُمی
کا؟"

اور لڑکیاں آنکھیں جھپکانا بھول گئیں اور پھر متین بھی آنکھیں جھپکانا
بھول گیا۔ بجلی کی لہروں نے اب اس کے دماغ میں دائرے بنانے شروع کیے اور
اس کی سانسیں تیز ہو گئیں اور وہ باہر جا کر گلی میں جھانک آیا۔ واپس آ کر اس
نے اپنے ہاتھ کا بوسہ لیا۔

"یہ مطلب ہے چُمی کا——" وہ مسکرانے لگا۔

"بھلا کیا مطلب ہے اس کا؟" اس کی پیٹھ میں بھی نبضیں اچھل رہی تھیں۔ "تم بتاؤ نوری۔"

نوری چُپ۔

"تم بتاؤ سُوداں۔"

سُوداں چپ۔

"تم بتاؤ صفو۔"

صفو بھی چپ۔

"اچھا تو تم بتاؤ مہراں۔"

اور مہراں بھی چُپ۔"

اور متین نے تیزی سے نوری کے ہاتھ کا بوسہ لے کر کہا۔

"یہ مطلب ہے اس کا۔"

نوری تڑپ کر اٹھ کھڑی ہوئی اور رونے لگی۔ سُوداں اور صفو اور مہراں بھی رونے لگیں اور لال گالوں کو بھگوتی کوٹھڑی سے باہر بھاگ گئیں۔

متین کے دماغ میں چکراتی ہوئی برقی لہروں نے الٹا رخ اختیار کر لیا اور وہ لڑکیوں کو واپس لانے کے لیے لپکا۔

"کیا ہے—— کیا ہے؟" اعظم نے کھڑکے کے پاس آ کر روتی ہوئی لڑکیوں سے پوچھا جو بھاگی جا رہی تھیں۔ ان کے سر کی اوڑھنیاں پیچھے دھول میں گھسٹ رہی تھیں اور ان کے چولے ہوا میں پھڑپھڑا رہے تھے۔

"سبق یاد نہیں کیا۔" متین نے نہایت مشکل سے حالات پر قابو پانا چاہا۔ "مَیں نے وجہ پوچھی تو رونے لگیں۔ میں نے رونے سے منع کیا تو بھاگ نکلیں۔"

"بے وقوفیں۔" اعظم نے دور گلی کا موڑ کاٹتی ہوئی لڑکیوں کی طرف

دیکھ کر کہا اور متین کے پاس آن بیٹھا۔

متین کے ہاتھوں میں بے پناہ جلن تھی۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے بے جانے بوجھے اس نے انگارے پر ہونٹ رکھ دیئے ہیں یا تپتا ہوا لوہا چوم لیا ہے۔ وہ اپنے اعصابی تشنج سے چھٹکارا پانے کے لیے اعظم سے باتیں کرنے لگا کہ دیہاتی لڑکیوں کی بے بنیاد شرم و حیا کے تیر بہدف تریاق موجود ہیں اور جن کے دم سے اس صدی کے عاشقوں کی راتیں آباد ہیں۔ متین شہری معاشقوں کی داستانیں سناتا رہا اور سینما ہالوں میں ملاقاتیں اور پارکوں میں مڈبھیڑیں اور پارٹیوں میں نظربازیاں۔

"مگر یہاں تو سر کا سَودا ہے صاحب۔" اعظم بولا۔ "کوئی کُنڈی ہتھے چڑھ جائے تو پَو بارہ ہیں' ورنہ سر کی بازی لگانا پڑتی ہے۔ اور پھر یہاں اِتنی بدچلن لڑکیاں بھی تو نہیں' اور جو بدچلن ہیں ان کی زندگی سُوت کے دھاگے سے لٹکتی رہتی ہے۔ ان دیہات میں ہر روز قتل کی وارداتیں نہ زمین کی وجہ سے ہوتی ہیں نہ زر کی وجہ سے۔ ان تمام حادثوں میں زن اور صرف زن کا ہاتھ ہے۔"

"اچھا——!" یہ کتابوں سے الگ نئی بات تھی۔

"کوئی چھوکر تو دیکھے کسی لڑکی کو۔ اسے کوئی بری نیت سے اس وقت چھُو لے تو سمجھ لو کہ شام تک وہ اِس دنیا میں نہیں۔"

"اچھا!" متین کی معلومات میں بھی اور خوف میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔

کچھ دیر کے بعد اعظم باہر کھیتوں میں بابا حاجی کا ہاتھ بٹانے چلا گیا اور متین نے سونے کی کوشش کی کہ اچانک ایک واویلا بلند ہوا اور اسے گلی میں ایک ہجوم نظر آیا جو کوٹھڑی کی طرف آ رہا تھا۔

وہ جلتے ہوئے ہونٹوں کو مَل کر اٹھا اور مارے خوف کے اس کی نبضیں بھڑک اٹھیں اور دل' ہتھوڑے سے چلانے لگا۔ لوگ لال لال آنکھیں نکالے

گلی میں جمع ہو گئے تھے۔ متین پسینے میں شرابور ہو گیا۔ جسم پر رعشہ طاری تھا۔ مسکرانے کی کوشش میں خشک باچھوں کو کھینچ تان کر پھیلایا اور بولا۔

"آیئے آیئے۔"

چند بزرگ اندر آ گئے۔ ہجوم چوپال کی سلوں پر بیٹھ گیا۔ چوپال پر کھلتا ہوا دروازہ واکر دیا گیا۔ ایک سفید ریش بولا۔

"بات یہ ہے میاں کہ تم یہاں اکیلے ہو' نہ بھائی حاجی ہے نہ اعظم خان ہے۔ ایک ضروری بات کرنی تھی تم سے —— تم نے یہ کیا کیا کہ آتے ہی ہمارے گاؤں کے چپ چاپ تالاب میں آئے دن بڑی بڑی چٹانیں گرانا شروع کر دیں۔"

متین نے کوٹھڑی کے دروازے کی طرف دیکھا۔ چاہا کہ یہاں سے بندوق کی گولی کی طرح سَنّ سے نکل جائے' اِن وحشیوں کے چنگل سے' اِن گستاخوں کے گھیرے سے دور چلا جائے۔

"اگر یہی حالت جاری رہی" بوڑھے نے کہا "تو یہ گاؤں آپس میں کٹ مرے گا۔"

متین نے ہونٹوں کو مَل کر ایک گہری سانس لی' اور ماتھے کا پسینہ الٹے ہاتھ سے پونچھ کر کھانسا۔

"ہماری جانیں خطرے میں ہیں' ہماری عزّتیں خطرے میں ہیں۔"

متین کا ٹمپریچر لپک کر کہاں سے کہاں نکل گیا۔ اس نے اپنے لبوں کی چنگاریاں بجھانے کے لیے انہیں زور سے مَلا اور بولا۔

"کیوں کیا بات ہے؟"

"بات یہ ہے۔" سفید ریش نے بولنا شروع کیا اور متین کے دماغ میں کئی گاڑیاں متصادم ہو گئیں —— "بات یہ ہے کہ سارے گاؤں کے دو بڑے گھُورے ہیں نا۔"

متین کے دماغ میں کوئی بچہ گانے لگا۔ "لازم ہے حمد تیری اے دوجہاں کے والی" —— اور دماغ کے دوسرے حصے میں کوئی نوجوان بولا۔ "سنبھل جا سنبھل جا۔"

وہ سنبھل بیٹھا اور بوڑھے کی باتیں سننے لگا۔

"مغربی محلے کا گھُورا جس شخص کی زمین پر تھا وہ کل پردیس سے واپس آیا ہے اور کہتا ہے کہ کُوڑا یہاں کیوں جمع ہوا ہے؟ اب جمع ہو گیا ہے تو اس کے بعد یہاں کوئی شخص کُوڑا نہیں پھینک سکے گا۔ اور مَیلے کا یہ ڈھیر اب اس کی ذاتی ملکیت ہے۔ وہ اس سے اپنے کھیتوں کو رنگے گا۔ اس پر کسی کے باپ کا اجارہ نہیں۔ اب ہم کہتے ہیں کہ کوڑا بھی وہیں پھینکیں گے اور تمہاری تجویز کی رُو سے مہینے بھر بعد اسے بیچ کر رقم گاؤں کے خزانے میں جمع کر دیں گے۔ ذیلدار یہاں ہے نہیں' کسی شہادت پر ضلعے گیا ہے۔ بابا حاجی باہر ہے۔ تم ہی کوئی رائے دو۔"

"میں سوچوں گا۔" متین نے اطمینان کی ایک سانس لے کر اپنے ٹھنڈے ہوتے ہوئے ہونٹوں کو چوما۔

"تمہارے سوچنے سے پہلے فساد ہو جائے گا۔"

"صبر سے کام لو۔" متین نے قائدانہ مشورہ دیا۔

"وہ گالیاں دیتا ہے تمہیں اور ہمیں سب کو۔"

"دینے دو۔"

"کیوں دینے دیں۔" باہر سے کوئی بولا۔ "شرم نہیں آتی؟"

بوڑھے نے اٹھ کر باہر ایک غضب ناک نوجوان کو خاموش کرایا اور متین کو شام سے پہلے کسی فیصلے پر پہنچنے کا مشورہ دے کر ہجوم کو ہمراہ لیتا چلا گیا۔

متین کچھ دیر تک کوٹھڑی میں گھومتا رہا اور جب مسجد میں عصر کی اذان ہوئی تو وہ باہر گلی میں آ گیا۔ چند عورتیں کنویں سے پانی بھر کر آ رہی

تھیں۔ اکڑ کر ان کے قریب سے گزرا تو کاجل بھری آنکھوں والی عورت نے حیران ہو کر کہا۔ "کیسے چلتا ہے مُوا' جیسے ہوا کے گھوڑے پر سوار ہے۔ اور وہ پہلا دن یاد ہے؟ جانے کہاں سے حوصلے نکالے ہیں۔ حاجی کے گھر تو صرف بڑھیا ہے۔"

عورتیں گاگریں تھام کر پلٹیں اور متین کو دیکھنے لگیں جو بہت آگے نکل چکا تھا۔ اس نے نکڑ پر سے مڑتے ہوئے ان کی طرف دیکھا' اور وہ سب یوں گھوم گئیں' جیسے متین کی نظروں نے ان سب کے چہروں پر بیک وقت زنّاٹے کے طمانچے جڑ دیئے ہیں!

(9)

سامنے سے اسے وہی لڑکی سر پر دو گاگریں رکھے آتی نظر آئی جس کی آنکھوں کی سحر آلود گہرائیوں اور آواز کے دلآویز ترنّم اور چال کی ناگن ایسی کُنڈلیوں نے اس کے دل پر چڑھے ہوئے سنگین خول کو چٹخا کر رکھ دیا تھا۔ متین وہیں نکڑ پر کھڑا اسے پاگلوں کی طرح گھُورنے لگا' اور جب وہ قریب آئی تو بولا۔

"رج کے نہ تکیاں اَکھیاں سانول یار دیاں"

"شرم نہیں آتی؟" لڑکی نے پلٹ کر نہایت تیزی سے کہا۔

"نہیں۔" متین نے رندانہ انداز میں جواب دیا۔

"بڑے بے شرم ہو۔"

"قربان جاؤں۔"

"کیا بکتے ہو؟"

"میری بکواس کا مطلب سمجھنے کی تمہیں کیا ضرورت ہے؟ بس تم بولتی چلی جاؤ دیکھتی چلی جاؤ۔"

"مَیں قتلے کروا ڈالوں گی تیرے۔" اس کی آواز میں آنسو' چنگاریاں' خنجر سب کچھ تھا' اور وہ کانپ رہی تھی' اور اس کی آنکھیں بیر بہوٹیاں بن گئی تھیں' اور چہرے کے پیالے میں خون چھلکنے لگا تھا۔ "بدمعاش' لُچّا' شُہدا۔"

متین نے تھیٹر کے ایکٹروں کا سا انداز اختیار کر لیا اور بولا۔

دشنامِ یار طبعِ حزیں پر گراں نہیں
اے ہم نفس! نزاکتِ آواز دیکھنا

لڑکی نے شعر کا مطلب شاید متین کے انداز سے اخذ کیا' دونوں بھری ہوئی گاگریں اٹھا کر پٹخ دیں اور اِس زور سے چیخنے لگی کہ بچے کیا چیختے ہوں گے۔ روتے اور بِلکتے ہوئے اس نے ایک پتھر اٹھایا اور گرجی۔

"جس کے گھر کے ٹکڑوں پر پل رہا ہے تو —— اُسی کے بیٹے کی منگیتر ——" اچانک اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا اور وہ ٹوٹی ہوئی گاگروں کے قریب دَھم سے بیٹھ گئی اور گھٹنوں میں سر چھپا کر رونے لگی۔

متین اِس صورت حال کے لیے قطعی تیار نہ تھا' دم بخود رہ گیا' اور پھر اس کا وہ ہم نفس جسے اس نے نزاکتِ آواز دیکھنے کی دعوت دی تھی' اس کے بالکل قریب آ گیا' اور ایک غضبناک چیتے کی سی تیزی سے متین پر جھپٹا مگر متین گیند کی طرح اچھل کر پرے جا گرا' اور پھر اعظم کے تیور دیکھ کر وہاں سے سرپٹ بھاگا۔ اعظم اس کے پیچھے تھا مگر اچانک گلی کے پرلے موڑ سے لوگوں کا واویلا سن کر رک گیا۔

"ہماری لڑکیوں کو چُمی کا مطلب سمجھاتا ہے بدمعاش!" یہ بابا حاجی کی آواز تھی۔ اور اعظم ہجوم کی طرف لپکا۔ لڑکی وہیں شکستہ گاگروں کے پاس بیٹھی رہ گئی' اور متین دور کھیتوں میں ہرن کی طرح بھاگا جا رہا تھا۔

بابا حاجی کے منہ سے جھاگ برس رہا تھا اور اسکے لبوں سے آوازوں کا ایک آبشار سا گر رہا تھا اور وہ اپنے بال نوچ رہا تھا اور اپنی رانوں کو گھونسوں

سے کوٹ رہا تھا اور چلّا رہا تھا۔

"آستین میں سانپ پالنا اِسی کو تو کہتے ہیں۔ تم دیکھتے کیا ہو، مجھے قتل کر ڈالو، میری بوٹیاں کتّوں کے آگے پھینک دو، میری لاش کو گِدھوں کے حوالے کر دو، مَیں نے ہی اسے پناہ دی تھی، مَیں نے ہی اسے ——" آگے بڑھ کر اعظم نے حاجی کو نئے واقعہ کی اطلاع دی تو وہ نچلے ہونٹ کو دانتوں تلے دبا کر ایک لحہ ہکّا بکّا کھڑا رہا اور پھر ایک چٹان پر اپنی کھوپڑی دے ماری۔ چند نوجوان لنگوٹ کس کر متین کے پیچھے بھاگے، جو اب پہاڑی کے دکھنی درّے سے اتر کر ان کی نظروں سے غائب ہو چکا تھا۔ بابا حاجی کے سر سے خون جاری تھا۔ دور اعظم کے گھر میں سرخا باؤلوں کی طرح بھونک رہا تھا اور لوگ چلّا رہے تھے۔

"گھوڑوں پر جاؤ، برچھے لے جاؤ، کبھی تو ملے گا، کہیں تو ملے گا ——"

اور دور مغربی اُفق پر سورج اپنے فق چہرے کو اُفقی گرد میں چھپانے کے لیے دبکا جا رہا تھا۔ ٹوٹی ہوئی گاگروں کے ٹکڑوں کو شفق نے گوشت کے قتلے بنا دیا تھا —— اور پھر کچھ دیر بعد جب مؤذّن نے مغرب کی اذان دی تو لوگ واپس گاؤں کو پلٹے۔ وہ سب خاموش تھے۔ صرف بابا حاجی، اعظم اور صوبیدار کے کاندھوں پر بازو رکھے گھِسٹتا آ رہا تھا اور بڑ بڑا رہا تھا۔

"انسان بڑا کمینہ ہے، بڑا ذلیل ہے، بڑا بدذات ہے؛ وہ بھی اور مَیں بھی اور تم بھی، سب کمینے ہیں اور ذلیل ہیں اور بدذات ہیں؛ وہ بھی ہے، مَیں بھی ہوں، تم بھی ہو، سب کمینے اور ذلیل اور بدذات ہیں سمجھے —— ارے سمجھے —— لفنگے؟"

⊛